جھومتے لفظ

غلام نبی اعوان

Marfat.com

جھومتے لفظ

غلام نبی اعوان

مقبول اکیڈمی
سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور

Marfat.com

©جملہ حقوق محفوظ

2012ء

اھتمام ملک مقبول احمد

ناشر مقبول اکیڈمی

سرورق انیس یعقوب

مطبع خورشید مقبول پریس

قیمت 400 روپے

MAQBOOL ACADEMY
Chowk Urdu Bazar, Circular Road, Lahore.
Ph: 042-7324164, 7233165 Fax: 042-7238241

10-Dayal Singh Mansion, The Mall, Lahore.
Ph: 042-7357058 Fax: 042-7238241
Email: mqbool@brain.net.pk

Marfat.com

ان محروم جذبوں

کے

نام

جنہیں زبان نہ مل سکی

Marfat.com

111775

Marfat.com

ترتیب

o حصہ اوّل

o جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا (۱)	08
o جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا (۲)	13
o ادیب، مونچھ اور سائنسدان	17
o دوسری شادی کی کہانی	21
o حسرت کی شاعری اور ہم	27
o بال کی کھال	24
o اے بی اشرف، ایک حوالہ	38
o جوانی کا آخری سال	34
o ادیب اور بیوی	49
o سسرال کا تحفہ	45
o مستنصر حسین تارڑ سے خیالی مکالمہ	63
o یادوں کے گلاب (۱)	.69
o یادوں کے گلاب (۲)	75
o یادوں کے گلاب (۳)	82
o حسن کا کباڑیہ......راسپوتین ڈیروی	88
o ایک عزیز کے نام خط	95
o تخیل کے کرشمے ہیں	99

Marfat.com

○ ملتان پر ایک حساس مضمون 103
○ سادھو درویش 109

○ حصہ دوم

○ ریاض انور کا فنی ارتقاء 115
○ سید احمد اختر ......ایک مطالعہ 123
○ میں، انوار احمد اور اُس کی خاکہ نگاری 138
○ ''اہل قلم کے خطوط'' ایک جائزہ، ایک تاثر 150
○ مصلوب......ایک تجزیہ 155
○ ''کسی حیران ساعت میں''......زندہ شاعری 159
○ آغا گل کے افسانوں کے خدوخال 166
○ تماش بینوں میں گھری ہوئی تعلیمی پالیسی 175
○ عورت اور رُسوائی 184
○ اے پاک زمیں! میں تیرا مجرم ہوں 194

Marfat.com

حصہ اوّل

Marfat.com

Marfat.com

جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا

کچھ عرصے سے میرا دماغ عجیب عجیب سوچوں اور اچھوتی خواہشوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ مثلاً پچھلے دنوں مجھے یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ انسان کو پر کیوں نہ لگ گئے۔ انہی صفحات میں اپنی اس خواہش کا میں نے اظہار بھی کیا تھا۔ اپنے گھر والوں سے ذکر کیا، تو وہ گھر والے تھے، میری بات سن کر میرا دل رکھا اور ہاں ہوں کر کے ٹال گئے۔ دوستوں سے اس حسرت ناتمام کا ذکر کیا تو کچھ نے ہمدردی سے مجھے اپنا ''میڈیکل چیک اپ'' کروانے کا مشورہ دیا۔ ان کے نزدیک میرے تحت الشعور لاشعور اور نہ جانے کون کون سے شعور پر سماجی عمل کے جبر و استبداد نے ضرب کاری لگائی تھی۔ جو زیادہ ہمدرد تھے انہوں نے میری اس خواہش لا حاصل کو ایک مکمل دانشورانہ بیماری قرار دے کر اس موضوع پہ دو روزہ سیمینار اور تعلیمی ورکشاپ منعقد کرنے کا ارادہ کیا۔ جب یہ سارا طوفان کھڑا ہو چکا تو میں خود کلامی کی کیفیت سے دوچار ہوا۔ کیا واقعی اگر انسان کو پر لگتے تو یہ دنیا جنت نظیر بن جاتی؟ کیا واقعی انسان کی خود غرضیاں اور نفس پرسیاں ختم ہو جاتیں؟ میرا طائرِ خیال ایک دفعہ پھر میرے جسم کا ساتھ چھوڑ کر اُڑ گیا۔

میں دیکھتا ہوں کہ فضائے بسیط کئی حصوں میں تقسیم ہے۔ سب سے اونچا حصہ وہ ہے جہاں ہوا بہت لطیف اور معطر ہے۔ یہ حصہ اسلام آباد کی شاہراہوں کی طرح کھلا کھلا اور صاف ستھرا ہے۔ میں اس حصے کے ایک کونے میں تنہا کھڑا ہوا پر ہلا رہا ہوں۔ کبھی کبھار سنہرے پروں اور خوبصورت کلغیوں والے خواتین و حضرات وہاں سے گذرتے ہیں اور گذرتے ہوئے مجھے عجیب عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں۔ میری نظر اپنے پروں پر پڑتی ہے، خاکستری خاکستری رنگ اور بے محابہ بھڑ پھڑانے کی آواز مجھے عجیب شش و پنج

Marfat.com

میں مبتلا کر دیتی ہے۔ یہ میرے اور اُن خراماں خراماں اُڑنے والے لوگوں کے پروں میں اتنا فرق یوں ہے؟ مجھے تشویش لاحق ہوتی ہے سوچتا ہوں کہ کسی سے اس بارے میں کچھ پوچھوں۔ اچانک اک ملگجا سا بورڈ مجھے ایک جگہ نظر آیا زیادہ تفصیلات تو میں نہیں سمجھ سکا، البتہ گریڈ اور اس کے آگے بیس، بائیس، چوبیس قسم کے ہندسے پڑھ کر میرا ذہنِ نارسا ایک نتیجے پر پہنچا اور اُن خوبصورت پروں والے لوگوں کی گھورتی نظروں کا مطلب کچھ کچھ سمجھ آ گیا۔ اب میں نے فضائے بسیط کے اُس بالائی حصے سے باہر نکلنے کے راستے تلاش کئے۔ خدا خدا کر کے ایک کھلی سی گلی مجھے نظر آئی۔ میں اس طرف پرواز کر گیا۔ گلی میں داخل ہوتے ہی ایک سنتری بادشاہ نے مجھے وِسل دی۔ اس کے ہاتھ میں چالان کی کاپی تھی۔ اس نے زمانۂ جاہلیت سے میرا شجرہ نسب پوچھنا شروع کیا اور ساتھ ہی میرے پروں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''اپنا حلیہ دیکھا ہے۔ ذات دی کوڑ کرِلی، چھتیراں نال جپھے۔ اُس طرف کیا لینے گئے تھے؟ فضاء کے کونسے طبقے سے آئے ہو؟ کس گھر کو تاڑا تھا؟ تم وہاں پہنچے کس طرح سے؟ تمہارا آوارہ گردی، سماج دشمن عناصر اور ٹریفک رولز کی خلاف ورزی میں چالان ہوگا، نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن، مرتا کیا نہ کرتا، جیب میں ہاتھ ڈالا۔ چند سکے نوشہرہ کے کباب کھانے کیلئے پس انداز کئے ہوئے تھے، سنتری بادشاہ کے ہاتھ پر مؤدب ہو کر رکھے اور آنجناب نے یہ فرما کر گلو خلاصی کی۔ ''کسی شریف گھرانے کی اولاد لگتے ہو۔ پہلا موقعہ ہے کہ کوئی غیر قانونی حرکت کرنے والا شہری میرے شکنجے سے چھٹکارا پا کر جا رہا ہے۔ آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا''۔ اس طرح میں فضائے بسیط کے دوسرے طبقے میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

خلائی طبقوں کا یہ انٹر کمپارٹمنٹ ہے۔ ہوا میں لطافت کم اور کثافت زیادہ۔ بلکہ کسی کسی وقت تو مردان کے گھوڑوں کی لید میں لت پت دھول کی سوندھی سوندھی بو نتھنوں کو اپنے ہونے کا احساس دلا رہی ہے۔ اس ہوائی کمپارٹمنٹ میں کافی رونق ہے زیادہ تر آنے جانے والے لوگوں کے پر میری طرح گدرے اور میل خورے ہیں۔ کہیں کہیں اکا

Marfat.com

دکا آدمی قدرے سنہری پروں اور خوش رنگ کلغی والا اور صاف ستھری چونچ والا بھی پرواز کرتے ہوئے نظر آجاتا ہے۔ یہاں میں نے بہت سے شناسا چہرے دیکھے۔ کچھ لوگ ذہن میں باقی رہ گئے۔ منشایاد کو دیکھا وہ ٹریفک رولز کی خلاف ورزی کرتا ہوا سڑک کے دائیں کنارے تیزی سے مائل بہ پرواز تھا۔ احمد داؤد پر نظر پڑی۔ یوں لگتا تھا جیسے اڑنے کی بجائے باکسنگ کی پریکٹس کر رہا ہو۔ منصور قیصر بھی آہستہ آہستہ پرواز کر رہا تھا۔ حسب سابق اُس کو آنکھوں کی تکلیف تھی، لیکن پر کچھ کچھ صاف سے لگتے تھے اور کلغی شلغی بھی دھلی ہوئی تھی (جس کے دو بیٹے ڈاکٹر بن جائیں تو سمجھئے اس نے پاکستان منی منٹ کھول لی۔ یہی منصور کو بھی کرنا ہے)۔ مجھے غضنفر مہدی بھی ملا۔ میرے قریب آئے بغیر اس نے مجھ سے ملتان کے روائتی انداز میں علیک سلیک کی۔ ''سائیں کیا حال اِن۔ اج ان تے کیویں آئے ودے ہوے۔ ایں ویلے ذرا دھیا ہویاں۔ ول گالھیں کر لیسوں''۔ (جناب کیا حال ہے۔ آج ادھر کیسے آنکلے۔ اس وقت ذرا مصروف ہوں۔ پھر بات کریں گے)۔ غضنفر مہدی کے اچھے خاصے سنہری پر لگے ہوئے تھے۔ کلغی بھی کافی شوخ شوخ تھی۔ وہ واقعی مصروف تھا اور بالائی طبقے میں جانے کیلئے ٹریفک قانون کے مطابق راستہ تلاش کرنے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ مجھے غضنفر کے ملتان کا وہ دور یاد آگیا جب وہ خاندانی منصوبہ بندی کی سیڑھی پر پاؤں رکھ کر نیشنل سنٹر تک آیا تھا اور اکثر مجھ جیسے لوگوں سے کہا کرتا تھا کہ اس کی منزل بہت دور ہے، وہ نیشنل سنٹر کی یخ بستہ زندگی میں سٹوریج ہونے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے اپنا کہا سچ کر دکھایا۔ اس کے سنہری پر اس کی ہمت اور عزم کی گواہی دے رہے تھے۔ ابھی اور آگے جانے کیلئے وہ راستہ تلاش کر رہا تھا۔ مجھے ایک موقعے پر عطاء الحق قاسمی بھی نظر آگیا۔ گو مائل بہ پرواز مگر کمر درد سے جھکی ہوئی۔ میری طرح کے گدرے سے پر اور میری طرح کی میلی سی کلغی۔ صرف یہ فرق تھا کہ آنجناب نے پان سے چونچ لال کی ہوئی تھی۔ مجھے ایک جگہ اختر امان بھی نظر آیا۔ خوش وخرم اور مطمئن گو کہ پروں اور کلغی کی حالت کوئی خاص قابل رشک نہیں تھی۔ (وہ گذشتہ چار پانچ سال سے اپنے بسیرے کو ٹھنڈا کرنے کیلئے ٹھنڈ والی مشین کی ریٹ لسٹیں تیار کر رہا ہے۔ ہر

Marfat.com

سیزن میں مجھ سے بھی ریٹ طلب کرتا ہے اس سیزن میں اس نے کوئی لسٹ نہیں بنائی اور میں اس حرکت سے ایک نتیجے پر پہنچا ہوں یہ نتیجہ صرف انگریزی کا ایک جملہ ہی بیان کر سکتا ہے۔ اُردو میں اس کیلئے لفظ نہیں ہے۔

("He gave up the idea as a bad job")

مجھے مشتاق شباب بھی اپنے منی ونگز کے ساتھ اڑتا ہوا نظر آیا۔ میرے قریب آ کر اپنی چونچ پر رکھی ہوئی عینک سے مجھے تاکا۔ ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''کتھے پیا پھرناں ایں''۔ وہی میری طرح بوسیدہ پر، بوسیدہ کلغی، بوسید چونچ مگر دل شباب۔ (مشتاق شباب نے سن چھیاسٹھ ماڈل اسکوٹر سن ستر عیسوی میں خریدا۔ آج تک اسے زیر پار کھا ہوا ہے۔ فخر سے خود بیٹھتا ہے، ساتھ مجھے بٹھاتا ہے اور سگمہ ہوٹل کے تکے پشاوری کی پاؤ بھر ڈھول کے ساتھ ''نوش جان'' کرواتا ہے) اور بھی بہت سے لوگ نظر آئے۔ کچھ کو میں نے نظر انداز کیا اور کچھ مجھے نظر انداز کر گئے۔ کافی دیر ہوگئی تھی مجھے اور میں نے اس ہوائی کمپارٹمنٹ سے باہر نکلنے کی ٹھانی۔ ایک ہوائی گلی نیچےکو جا رہی تھی، میں اس پر پرواز کر گیا۔ ایک نیا خلائی رستہ کھلا ہوا تھا۔ یہ ہوائی طبقوں کا دھک پورہ تھا۔ زندگی ہر طرف دربدر اور خاک بسر تھی۔ لوگوں کو پر نہیں کھمب لگے ہوئے تھے۔ پر تو اڑنے کیلئے ہوتے ہیں مگر ''کھمب'' چھوٹی چھوٹی ''اوڈاریوں'' کے کام آتے ہیں۔ لمبی پرواز کھمبوں سے ممکن نہیں۔ (اگر میں نے یہ اصطلاح غلط استعمال کی ہو تو آپ اشفاق احمد صاحب سے تصدیق کرالیں) یہاں سب کٹے پھٹے پروں والے اور زخمی زخمی کلغیوں والے لوگ تھے۔ ہر طرف خاموشی اور افسردگی کا راج تھا۔ عسرت کا تعفن تھا۔ کچھ لوگوں نے تھوڑی دیر کیلئے میری طرف دیکھا مگر پھر لاتعلق ہو کر اپنی ملول دنیا میں مصروف ہو گئے۔ کوئی شخص ہوا میں اُڑ نہیں رہا تھا۔ سب گردنیں نیٹھورائے اس متعفن زمین پر بیٹھ کر اکھڑے اکھڑے سانس کھینچ رہے تھے۔ میں ابھی ان کے بارے میں غور ہی کر رہا تھا کہ کمبخت ملازم نے میرا اسارا تصوراتی تانا بانا اُدھیڑ دیا۔ ''صاحب جی! دوا کا وقت ہو گیا ہے دوائی کی خوراک لے لیں''۔

Marfat.com

جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا

گذشتہ ہفتے دس دِن سے میرے گھٹنے میں درد ہے۔ خدا جانے مجھے یہ چوٹ کہاں سے لگی۔ درد بڑھا تو میں ڈاکٹر کے پاس گیا۔ آدھے گھنٹے تک وہ مجھ سے ''کیس ہسٹری'' سنتے رہے۔ اور پھر یہ کہہ کر مجھے میڈیکل سپیشلسٹ کو ریفر (REFER) کر دیا کہ یہ کیس اُن کا نہیں ہے۔ پہلے تو مجھے کیس لفظ پر اعتراض تھا کہ ایک شریف آدمی بھلا چنگا آدمی ہوتا ہے۔ بیمار ہو جائے تو اُس کی وجودی حیثیت تبدیل کر کے اُسے کیس کیوں بنا دیا جاتا ہے۔ بہر حال ڈاکٹروں کے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کی بجائے میں میڈیکل سپیشلسٹ سے مِلا۔ پھر آدھا گھنٹہ کیس ہسٹری کا چکر چلا۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے خون اور پیشاب ٹیسٹ کرانے کی ہدایت کی اور دوسرے دِن ٹیسٹ رپورٹوں کے ساتھ دوبارہ حاضر ہونے کی تلقین کی۔ لیبارٹری کے عجیب وغریب قصابانہ ماحول سے کشید ہو کر میں دوبارہ حسبِ حُکم حاضر ہو گیا۔ تمام رزلٹ دیکھنے کے بعد اُنہوں نے مجھے دو تین قِسم کے محلول شربت اور دو تین قِسم کی گولیاں کھانے کو لکھ دیں۔ میرے گھٹنے میں درد ہے اور میں گذشتہ ہفتے عشرے سے مسلسل گولیاں کھا اور شربت پی رہا ہوں۔ مُنہ کا ذائقہ گھنٹوں خراب رہتا ہے۔ یہ مشق ستم مجھے دِن میں تین دفعہ کرنی پڑتی ہے۔ درد گھٹنے میں اُٹھا اور عذاب آیا مُنہ اور پیٹ پر۔ اہل زبان تو بہر حال فصیح لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن مجھے اگر کسی امتحانی پرچے میں یہ سوال آئے کہ ''اردو محاورے ماروں گھٹنہ پھوٹے آنکھ کی وضاحت مثال دے کر کرو، تو میں درج بالا مثال دوں گا۔ ویسے یہ اِنسان کے ساتھ سائنس نے ظلم نہیں کیا کہ درد کہیں اور دوا کہیں۔ بس میں سوچ میں پڑ گیا۔

Marfat.com

پرسوں میرا پیڈسٹل فین چلتے چلتے مختلف ساز و آواز کا مظاہرہ کرنے لگا۔ میں فوراً اُٹھا دکان دار کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق پنکھے کے دو سوراخ نما کانوں میں چند قطرے مشین آئل کے ڈالے اور دیکھتے ہی دیکھتے پنکھا بھلا چنگا ہو کر پھر چل دیا چوں چاں اور گھوں گھاں کی آواز ختم ہو گئی۔ ذرا سا پنکھے کا سر ہلتا ہوا نظر آیا تو پیچ کس لے کر دو نٹ کس دیئے سر کا ہلنا بند ہو گیا۔ ایک ہم انسان ذات ہیں کہ جس کا سر ہچکولے کھانے لگے ڈاکٹر کہتے ہیں کہ دن لد چکے ہیں۔ جو کھانے کو مانگے، دو کچھ مت کہو۔ خدا جانے کس وقت سانس کی ڈوری ٹوٹ جائے۔ میں سوچنے لگا کہ اگر خالق کائنات اِنسانوں کے مینو فیکچرنگ میں بھی وہی کچھ کرتا جو اِنسان اپنی تخلیق کے ساتھ کرتا ہے تو مولا کی خدائی میں کیا فرق پڑتا۔ مگر وہ بے نیاز ذات ہے ہم اُس کے آگے دم تو نہیں مار سکتے مثلاً مجھے دیکھیے درد مند گھٹنے کی خاطر ہفتے عشرے سے کڑوی کسیلی دوائیں اندر انڈیل رہا ہوں۔ جب تک دواؤں کا اثر رہتا ہے تو درد دبا رہتا ہے۔ جونہی اثر ختم ہوتا ہے۔ درد پھر عود کر آتا ہے۔ اگر میرے گھٹنے کے ارد گرد کہیں پیچ لگے ہوتے تو اولاً میں خود اِتنا بُدھو نہیں۔ پیچ کھولتا۔ اندر سے میکنزم پر نظر ڈالتا۔ ایک دو تاروں کو دائیں بائیں کرتا۔ پیچ دوبارہ فِٹ کرتا اور پھر یہ جا وہ جا۔ اگر کچھ زیادہ آرام پسند ہوتا تو ڈاکٹر کے پاس جاتا۔ ارجنٹ فیس دیتا اور ڈرائی کلین کے ارجنٹ کپڑے کی طرح دوسرے لوگوں سے پہلے تندرست و توانا ہو کر نکل جاتا۔ بازو ٹوٹ جاتا ہے تو بازو پر سفید پلاسٹر آف پیرس چڑھا دیا جاتا ہے اُس پتھر نما چیز پر ڈاکٹر ڈیڑھ ماہ بعد کی کوئی تاریخ لکھ دیتا ہے۔ مریض کے گلے میں ایک رسی ڈال کر اُس ٹوٹے ہوئے بازو کو اُس رَسی پر سہارا دے کر مریض کو عجیب سا ہونق بنا دیا جاتا ہے۔ اب ڈیڑھ ماہ تک مریض اپنی تکلیف کا چلتا پھرتا اِشتہار بن کر گلیوں، بازاروں، دفتروں اور دکانوں میں پھرتا رہتا ہے۔ اگر مریض کی پبلک ریلیشننگ بہت زیادہ تگڑی ہے تو دِن میں ہزاروں دفعہ اُسے اپنی داستانِ غم بیان کرنا پڑتی ہے۔ پھر بعض

Marfat.com

زیادہ ''کین آبزور'' ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو پلاسٹر پر لکھی ہوئی تاریخ کی تحریر پر گھنٹوں گفتگو کر سکتے ہین۔ وہ ڈاکٹر کے ذاتی کردار سے لے کر اُس کے پروسیوں اور یاروں کی عادات و خصائل کے بارے میں تحریر کے سٹائل سے اندازہ لگا لیتے ہیں اگر بازو کے جوڑوں میں کہیں پیچ، نٹ یا کابلے وغیرہ لگے ہوتے تو اِتنا بڑا کھڑاک ہی نہ ہوتا۔ بازو ٹوٹ گیا تو پیچ علیحدہ کیئے۔ اول تو چھینڑی ہتھوڑے سے کام چلا کر فوری طور پر تندرست کرلیا ورنہ اُتار کر ڈاکٹر کے حوالے کر دیا۔ اُس سے تاریخ واپسی کا کیش میمو لے لیا۔ اور پھر دنیاداری میں مصروف ہو گئے۔ نہ گلے میں پٹی باندھنے کی مصیبت اور نہ لوگوں کو اپنی روائیدادِ غم پیش کرتے رہنے کا تردد۔ تاریخ واپسی پر جا کر بازو فِٹ کرایا اور پھر دنیاداری میں پورے زور شور اور جذبے سے مصروف ہو گئے۔

یہاں اپنی خواہش کے حق میں دلیل دینے کے لئے ایک ذاتی قسم کی مثال دینی پڑ رہی ہے۔ کچھ دن پہلے ایک ٹانگ والے نے میری گاڑی کو ٹکر ماردی۔ دروازے پر اتنا بڑا ''ڈینٹ'' پڑ گیا کہ دروازہ اندر کو پچک گیا۔ میں گاڑی ''ڈینٹر'' کے پاس لے گیا۔ اس نے فوراً گاڑی کا دروازہ کھولا، کاغذ پنسل لے کر نقصان کا تخمینہ لگایا۔ تین ہزار کا کیش میمو میرے ہاتھ میں پکڑایا اور چار دن کے بعد دروازے فِٹ کرانے کا کہہ دیا۔ میں چار دن کی بجائے چار ہفتے بغیر دروازے کے گاڑی چلاتا رہا اور پیسے کا بندوبست کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔ اس دوران میں خود کو سلطان گولڈن سا محسوس کرتا رہا...... آپ نے بسوں اور گاڑیوں میں مشاہدہ کیا ہوگا کہ خطیب اور مقرر قسم کے ''پھیری باز'' مختلف لال پیلے رنگ کی دوائیوں اور سرموں کی خطیبانہ صدا لگاتے پھرتے ہیں۔ شعلہ بیان مقرر ہوتے ہیں اپنی بات کر لینے کے بعد کمپنی کی مشہوری کے لئے دو روپے والی شیشی آٹھ آنے میں دینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اپنے اِسی خطاب میں دانتوں کے درد کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ باپردہ بہنوں بیبیوں کے بارے میں بڑی دلسوزی کے ساتھ ذکر کر کے ایک اسلامی سا

Marfat.com

منظر کھینچتے ہیں کہ جب ایک بہن بی بی ڈاکٹر کو ہاتھ دکھانے کے لیے تیار نہیں ہوتی تو بھلا دانت کیسے دکھائے گی۔ ایسی صورت میں وہ ڈاکٹر کے پاس جانے کی بجائے درد سے بلبلا کر مر جانے کو ترجیح دے گی۔ پھر وہ پتلی قلعی میں لپٹی ہوئی ایک چھوٹی سی شیشی نکال کر بتاتے ہیں اِس شیشی سے بی بی کے دینی جذبات بھی مجروح ہونے سے بچ جاتے ہیں۔ اور درد بھی رفع ہو جاتا ہے۔ یہ شیشی عام طور پر مسافر خرید لیتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ دانتوں اور جبڑوں میں کچھ سکرو اور قبضے لگے ہوئے ہوتے اور ہم پردہ دار بی بی کو چنداں تکلیف دیے بغیر نٹ وغیرہ ڈھیلے کر کے جبڑہ نکالتے اور تھیلے میں ڈال کر ڈاکٹر صاحب کو دکھا آتے۔ آپ بھی میری طرح سوچ رہے ہیں۔ کیا خیال ہے، یہ آئیڈیا اور سوچ بُری تو نہیں۔

Marfat.com

ادیب، مونچھ اور سائنسدان

دِل اک قطرۂ لہو تھا مگر
سارے عالم کے سر بَلا لایا

جب سائنسدانوں نے دعویٰ کیا کہ دل پمپ سٹیشن کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بس ڈاک خانے کی طرح دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اور اوپر سے نیچے، نیچے سے اوپر کی طرف ڈاک کی طرح لہو...... بھیجنے کا کام کرتا ہے۔ اس وقت سے پولیس والوں نے شاعروں کا اعتبار کرنا چھوڑ دیا ہے۔ دوروغ بر گردن قاری، ایک بڑا شاعر تھانے میں اپنے گھر ہونے والی چوری کی رپٹ درج کرانے گیا تو تھانے والوں نے یہ کہہ کر اس کی اشک شوئی سے انکار کر دیا کہ "میاں تم تو بڑے بے اعتبار آدمی ہو۔ کتنے عرصے سے تمہارے پیشہ ور بے اعتبار شاعر دل کی چوری کی جھوٹی دہائیاں دیتے پھر رہے ہیں اور ہمیں بلا وجہ پھڈا ڈالا ہوا ہے۔ کبھی رقیب کو سازش کا سرغنہ قرار دیتے ہیں تو کبھی معصوم معصوم چہرے والے لوگوں پر نامزد پرچے کٹواتے ہیں۔ یہ تو اب راز کھلا ہے کہ تم لوگ اس اٹوٹ انگ قسم کی چیز کا واویلا مچا کر معاشرے میں خوف و ہراس پھیلا رہے ہو۔ شاعر کے اعتبار کو دوسرا چرکہ اس وقت لگا جب دشمن شعر موجدوں نے انکشاف کیا کہ چاند پر گڑھے ہیں۔ دھول ہے اور بے نوری ہے۔ بھلا تو کہاں چاند اور چکور کے قصے، چاند کے حوالے سے حسن یار کے قصے اور یار کے ناراض دنوں میں چاند سے تنہائی میں باتیں، عہد و پیمان میں چاند کو گواہ بنانے کے واقع اور بدلی سے نکلتے ہوئے چاند کے شرم و حیاء کی نظر طرازیاں اور کہاں یہ سنگلاخ انکشاف کیا کہ وہ بے آب و گیاہ سرزمین ہے۔ جس کے

Marfat.com

سینے سے پر گڑھے ہی گڑھے ہیں۔ چنانچہ شاعر لوگوں سے چہرہ چھپائے پھرتا ہے اور جب کوئی معتبر قسم کے غیر ادیب دوستوں سے واسطہ پڑتا ہے تو بے چارے کو ٹھٹھے مذاق کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کوئی بھی تو آدھی چھٹانک کا قلم پکڑنے والا ایسا دانشور نہیں جو شاعر کے دِفاع کو آئے۔ حسن و عشق کے سارے تلازمے، تشبیہات اور استعارے کچی دیوار کی مانند دھڑام سے نیچے آرہے ہے۔ اب سنا ہے کہ انہوں نے مونچھ کو ہدف بنایا ہے۔ تو لیجئے قصہ تمام ہوا۔ اول تو ہمارے دانشوروں کی اکثریت پہلے ہی ورغلائی ہوئی تھی کہ داڑھی کے ساتھ ساتھ مونچھیں صاف کرا کے دسمبر کے صحت مند شلجم سا چہرہ نکالنے کو پسند کرتی تھی۔ جو چند دھان پان سے ادیب مونچھیں پال کر اپنی شخصیت کو چار چاند لگانے کی کوشش میں تھے۔ اب کافی مایوس ہوئے۔ میری اپنی مایوسی تو انتہا کو پہنچی ہوئی ہے کہ مجھے اِسی شہر میں رہنا ہے اور یہ مونچھیں میرا دفاع کرتی ہیں۔ میں دھان پان تو نہیں قدرے لحیم شحیم ہوں۔ بلکہ شحیم کم ہوں۔ لحیم ہی لحیم ہوں۔ یہاں آنے سے پہلے میں اکثر ان مونچھوں کے بلاضرورت ہونے کا احساس کرتا تھا۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ ریزر اس فصل بے جواز کو کاٹنے کے لئے پہنچ گیا مگر کسی غیر مرئی طاقت نے اسے مذموم حرکت سے روک لیا لیکن یہاں آکر نہ صرف ان مونچھوں کی اہمیت کا احساس ہوا بلکہ میں نے انہیں مکھن کھلوا کر ان سے ڈنٹر بھی پیلوائے تا کہ ان میں جذب کرنے کی طاقت زیادہ سے زیادہ پیدا ہو۔ یہ جذب کرنے کا مسئلہ بھی ذرا تشریح طلب ہے۔ آپ کبھی میرے شہر آئے ہیں؟ یہ بھی عالم میں ایک عجب سا انتخاب شہر ہے نہ شہروں جیسا شہر کہ مہذب رونقوں سے کافی دور ہے اور نہ دیہاتوں جیسا دیہات کہ نوابوں اور خانوں کی سرزمین کے ساتھ یہ ضلع ہیڈ کوارٹر بھی ہے۔ بس ایک تیسری مخلوق قسم کی چیز ہے، ٹانگوں کا شہر ہے۔ شہر میں گھس جائیے تو باریک باریک خاکینہ دھول سوکھی لید سے مل کر ہر آنے جانے والے پر چھیاں ڈال ڈال کے واری واری جاتی ہے ایک کونے سے گھس کر دوسرے کونے سے باہر نکلئے۔

Marfat.com

اپنے گھر والے بھی آپ سے شناختی کارڈ طلب کر لیتے ہیں۔ مکھن ملائی اور ڈنٹر پلائی مونچھوں کا یہ فائدہ ہوتا ہے۔ کہ جب بھی شہر کا چکر لگا کر واپس آتا ہوں تو مونچھوں کے پلڑے پاؤ پاؤ بھر دھول کو آسانی سے اٹھا کر لے آتے ہیں۔ اگر مونچھیں نہ ہوں اوران پر مکھن نہ لگا ہو تو شہر کے ہر چکر کے بعد شکم پری کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ بات تو بر سبیل تذکرہ درمیان میں آ گئی تھی۔ اصل تذکرہ مونچھوں کے بارے میں حکیموں ڈاکٹروں اور سائنسدانوں کی رائے کا ہو رہا تھا۔ مونچھ اس فتوے کے بعد نیچی ہو گئیں ہیں۔ اور ''مونے'' دانشوروں کو اپنے کچھ کچھ سائنس دان ہونے کا شک ہونے لگا ہے۔ بلکہ ہمارے بعض ''مونے'' اور بے تکلف دانشور تو ہمیں ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں ''دیکھا ہمارے صاف شفاف چہروں کی تائید سائنسدانوں نے بھی کر دی ہے''۔ کلین شیو دانشوروں کا یہ سلسلہ احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی، منصور قیصر وغیرہ ہم سے لے کر مسعود انور شفقتی، محسن احسان تاج سعید اور مشتاق شباب تک پھیلا ہوا ہے اعداد و شمار کا یہ تجزیہ ظاہر کرتا ہے کہ ہمارا دانشور بھی اب دنیا دار ہوتا جا رہا ہے۔ البتہ مونچھوں کی فکر میری طرح ظفر علی راجہ کو بھی ہے اور اس کا اظہار وہ ''زاویہ ظفر'' میں بھی کر چکے ہیں۔ جب سے سائنسدانوں کا مونچھوں کے بارے میں یہ انکشاف سامنے آیا ہے مجھے ایک اور بیماری چمٹ چکی ہے۔ جب کوئی مونچھوں والا ملتا ہے تو میں اپنی چشم تصور میں اس کی مونچھیں ہنا کر اس کا جائزہ لینا شروع کر دیتا ہوں اور جب کوئی مونا سامنے آئے تو اسے مونچھوں کا جوڑا لگا کر اس کی شخصیت کو بھانپنے لگتا ہوں مسعود انور، شفقتی، محسن احسان، تاج سعید اور مشتاق شباب تو ایسے لوگ ہیں جن سے اکثر ملتا رہتا ہوں اور ہر ملاقات میں ان یاروں کو چشم تصور میں مختلف سائز کی مونچھیں لگا کر ان کی بدلتی ہوئی شخصیتوں سے لطف اٹھاتا ہوں۔

جب سے مونچھوں کے بارے میں یہ تحقیق سامنے آئی ہے بہتر مستقبل کے

Marfat.com

تصور میں خوش خوش رہنے لگا ہوں۔ وہ دِن دور نہیں جب سائنسدان مژدہ سنائیں گے کہ سر کے بال بھی مضرِ صحت ہیں۔ پھر مجھے بھی ٹوپی پہننے رکھنا یا چندیا کو چھپانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں بدھ بھکشوؤں کی طرح سڑک پر فخر سے چل سکوں گا اور یہ احساس نہیں ہوگا کہ

یہ لوگ کیوں م میرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

میں سمجھتا ہوں کہ سائنس دانوں کی یہ دریافت انور مسعود (انارکلی والے) کے لئے بھی تسلی و تشفی کا کام دے گی۔ بے چارے نے سالوں سے اپنے سر کو حجام کی قینچی کا دیدار نہیں کروایا۔ انگور کی بیلوں کی طرح دائیں بائیں سے بال اٹھا کر درمیان میں ڈال رکھے ہیں تاکہ شورزدہ زمین کچھ تو ڈھانپی رہے۔ مجبوری بری بلا ہے خدا سب کو بچائے۔ میں تو یوں بھی سر کو ڈھانپتا ہوں کہ اگر ذرا سی بھی ہوا چلے تو سر میں صحرائے گوبی پر کھجلی ہونے لگ جاتی ہے اور سر درد ڈاگ لگ چمٹ جاتا ہے۔ بس انتظار ہے اس دن کا جب کلین شیو دوستوں اور بال بردار احباب کو ملتے ہوئے میں بھی اپنی چندیا پر فاتحانہ ہاتھ پھیر سکوں گا۔

ہزاروں خواہش ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے

Marfat.com

دوسری شادی کی کہانی

ملتان تبادلے سے دِل کی بہت سی حسرتیں اور خواہشیں پوری ہوئیں اِن خواہشوں میں سب سے بڑی خواہش تھی دوسری شادی کے بارے خود کو ''فائٹنگ فِٹ'' سمجھنا۔ ہمیشہ سے یہ حسرت ہی دِل میں رہی کہ عملی طور پر میں دوسری شادی کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا کم اِزکم اپنی زوجہء محترمہ کے دِل میں یہ شک ہی پیدا ہو جائے کہ گھریلو جنجالوں کے باوجود فدوی میں دوسرا بیاہ رچا لینے کی اہلیت وقابلیت موجود ہے الحمدللہ کہ یہ حسرت ملتان آ کے پوری ہوئی بلکہ اِس طرح سے پوری ہوئی کہ صرف شک کی بجائے ہماری رفیقہء حیات کے دِل میں یہ یقین بیٹھ گیا کہ ہم نے ملتان میں ایک عدد جواں سال وخوش خصال پری سے نکاح کر لیا ہے۔ اور سرکار کے عطا کردہ بنگلے میں جوانی کے مزے لوٹ رہے ہیں بلکہ اچھے خاصے گل چھڑے اُڑا رہے ہیں۔

صاحبو! اِس اجمال کی تفصیل کچھ اِس طرح سے ہے۔

ملتان میں نیا نیا وارد ہوا تو خبر پڑی کہ مکان حاصل کرنے کے لیے ... لسٹ رجسٹر میں اپنا نام پتہ درج کروانا پڑتا ہے۔ اور پھر دفتری ہمہ ہمی میں مصروف رہ کر اپنی باری کا انتظار کرنا ہوتا ہے۔ قہر درویش بر جانِ درویش نام لکھوا کر ہم مَس میں لد آئے وہاں بھی کمرہ کافی تگ ودو اور منت سماجت سے مِلا۔ بہر حال مقدر کا فیصلہ سمجھ کر ہم نے اپنے کمرے کا چہرہ مہرہ صاف ستھرا کر لیا بیوی کو خط لکھ دیا کہ ابھی سردی ہے یہاں کا قانون ہے کہ سردی میں مکان وغیرہ نہیں ملتے میرے ساتھ اور بھی کئی بھائی بند ہیں جو اِس قانون کی وجہ سے مَس میں رہ رہے ہیں۔ لہذا گھبرانے کی ضرورت نہیں جونہی کوئی مکان

Marfat.com

الاٹ ہوا آپ لوگوں کو آ کر لے جاؤں گا۔ فی الحال دیہات کی کھلی فضا کا لطف اُٹھائیں اور سردیوں میں دیہات کی سوغات گڑ، گکوا اور روسے کام و دہن کو محظوظ کریں۔

اِس دوران چار پانچ ماہ کا وقفہ پلک جھپکتے گذر گیا جب کبھی اتفاقی چھٹی پر گھر جانے کا موقعہ بنا تو ویٹنگ لسٹ کا فلسفہ عام فہم غیر فوجی انداز میں اپنی رفیقہ حیات کو سمجھا کر اُسے صبر و تحمل کی تلقین کر دی۔

عطا میرا پھوپھی زاد بھائی ہی نہیں بچپن کا لنگوٹیا بھی ہے۔ آج کل ایک دوا ساز لیبارٹری میں کیمسٹ لگا ہوا ہے۔ اسے جب پتہ چلا کہ میں ملتان آ گیا ہوں تو ایک دِن صبح سویرے بذریعہ بس میرے مَس میں آوارد ہوا۔ ایک تو ویسے ہی کچھ مُنہ پھٹ آدمی دو جا لنگوٹیا۔ جو خرچہ ممکن ہو سکتا تھا اُس ذات شریف نے مجھ غریب کے ناتواں کندھوں پر ڈال دیا۔ ٹھاٹ باٹ کے ماکولات و مشروبات سے لے کر اخراجات کا دائرہ سینماؤں اور ہوٹلوں کی آوارہ گردی تک پھیلتا چلا گیا۔ دو دِن کے قیام کے بعد آنحضرت کی مراجعت وطن ہوئی خرچے کے ڈانڈے پورے مہینے کے اصراف سے جا ملے تھے بہر حال ہم خوش تھے کہ ایک دوست کا اچھا سواگت ہوا۔ اور اُسے دوستی کے شانِ شیان طریقے سے الوداع کیا گیا............

جب بچوں کے لیے جی بہت اُداس ہوا تو چند دِن کی چھٹیاں لے کر میں گاؤں چلا گیا۔ گھر جو داخل ہوا تو عجیب ہی منظر پایا۔ مشفق ماں جو چھٹی آنے پر میری بلائیں لیتے نہیں تھکتی تھی بگڑی بگڑی سی تھی۔ والد بزرگوار جو میری آمد پر ہمیشہ مجھے دُعا دے کر گلے لگایا کرتے تھے، مجھ سے کھنچے کھنچے سے تھے چھوٹی بہن نے اتنا تک نہ پوچھا کہ بھیا خیریت سے آئے ہیں؟ اپنی رفیقہ حیات کا دُور دُور تک کہیں پتہ نہیں تھا۔ پورے گھر کی فضا بدلی ہوئی تھی۔ کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا آسیب پڑ گیا ہے۔ یہاں تک کہ گھر کی پُرانی خادمہ مائی جیواں کے تیور بھی شکایتی قسم کے تھے۔ اگر چہ بڑے وسوسے دِل و دماغ کی

111775

Marfat.com

دیواروں سے ٹکراٹکرا کر واپس جا رہے تھے۔ بہرحال معاملے کی وضاحت کا مسئلہ ہم نے شام کے کھانے تک ملتوی کر دیا۔ اِس دوران بچوں کو دیکھنے کی بڑی کوشش کی۔ لیکن ہم محترمہ کے تعاقب میں ناکام رہے کیونکہ جس جگہ اُس کی شنید پڑتی یا جس کمرے سے مُرلی سی مترنم آواز کان پڑتی، ہم کشاں کشاں پہنچتے تو معلوم ہوتا کہ ابھی باھر نکلی ہیں۔ صحن میں وہ ہمیں اندھیری رات میں روشن دیے کی طرح یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں آتے جاتے نظر آجاتی تھیں مگر مشرقی شرم و حیا ہمارے اڑے آئی اور تمام اہل خانہ کی موجودگی میں سبک سر بن کر اُن سے سرگرانی کی وجہ نہ پوچھ پائے۔ اپنے کمرے کے بیچوں بیچ اور صحن میں کھلنے والے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر ہم نے اپنی رفیقہ حیات کو بڑے اشارے کیئے۔ متوجہ کرنے کے لئے طرح طرح سے کھنکار دیکھا۔ مگر انہوں نے لفٹ ہی نہ کرائی۔ بہت غصہ آیا مگر یہ سوچ کر بڑا ترس بھی آیا کہ دیہات میں آجانے کی وجہ سے عین ممکن ہے کہ ہماری بیوی کے کان میل وغیرہ سے بند ہو گئے ہوں۔ کیونکہ دیہات میں سی ایم ایچ کی بہاریں تو نہیں مل سکتیں۔ بڑی چھاؤنیوں میں تو کتنا آرام ہوتا ہے۔ سی ایم ایچ کی سہولتیں موجود ہوتی ہیں۔ سر درد سے لے کر مالیخولیا تک کے علاج کے لیے پندرہ نمبر، بائیس نمبر اور اٹھائیس نمبر کی داواؤں کے محلول بڑے بڑے مرتبانوں میں بھرے ہوتے ہیں اور بلا تخصیصِ مرض باآسانی مل سکتے ہیں۔

خیر سے شام ہوئی چند دوست ملنے کو آگئے۔ اُن کے رخصت ہوتے ہوتے اجتماعی کھانے کا وقت نکل چکا تھا۔ اپنے کمرے میں آیا۔ ہاتھ وغیرہ دھوئے اور کھانے کے لئے تیار ہو کر بیٹھ گئے۔ ہماری رفیقۂ حیات کھانا لے کر آئیں۔ کھانا ہمارے سامنے رکھا جا رہا ہے اور چہرہ مبارک دیوار کی طرف ہے۔ ہم سے نہ رہا گیا اور گویا ہوئے۔

''دیکھئے! اگر میری وجہ سے آپ کو کوئی تکلیف پہنچی ہے۔ تو آپ کو شکایت کرنے کا پورا پورا حق ہے۔

Marfat.com

محترمہ تو پھٹ پڑیں اور فرمایا۔

''میں نصیبوں جلی کون ہوتی ہوں آپ پر حق جتلانے والی۔ حق تو اُس مونڈی کاٹی حرافہ کا بنتا ہے۔ جس نے شبخون مار کے مجھے مظلوم کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ مجھ سے اکتا گئے تھے تو بتلا دیا ہوتا۔ میں اپنے ہاتھ سے سہرے بندھا کر آپ کے لئے اُس نوج کو لے آتی۔ جگ ہنسائی تو نہ ہوتی۔ بنگلہ اُسے لے کر دے دیا ہے۔ اور مجھ نصیب ماری کو ''ویٹنگ لسٹ'' کے فلسفے سمجھا سمجھا کر خوش آئند مستقبل کے سبز باغ دکھاتے رہے۔ میں تو کوستی ہوں اُس دن کو جب میرے بھولے باپ نے رشتہ کے لئے ہاں کر دی تھی ہائے! مجھ بدنصیب کا گھر اُجڑ گیا۔ اللہ کرے وہ بیسوا بھی کبھی چین سے نہ رہے جس نے میرا چین لوٹا''۔

زوجۂ محترمہ کے اس کلام بلاغت نظام کے بعد ہمارے ذہن میں کئی خیالات زناٹے سے آئے اور گذر کر چلے گئے۔ تقریر پرتاثیر سننے کے بعد پہلا خیال جو ہمارے دِماغ میں آیا یہ تھا کہ ہماری بیوی اچھی خاصی سیاستدان ہیں۔ شادی کے فوراً بعد اُسے بچے پیدا کرنے کا مشن دینے کی بجائے اگر سیاستدان بننے کو چھوڑ دیا جاتا تو آج گھر کا خرچہ اس طرح تنگی ترشی سے نہ چلتا۔ نہ محترمہ گھر پر موجود ہوتیں نہ چولہا گرم ہوتا اور خرچ اُٹھتا۔ ہمارے ذہن میں جو دوسرا خیال گذرا، وہ کافی خوشگوار اور روح افروز تھا یعنی کہ بچوں کی موجودگی اور عیالداری کے جھنجھٹ کے باوجود ہماری بیوی کی نظر میں دوسری شادی رچا لینے کے دم خم ابھی تک ہم میں موجود ہیں۔ ایمانداری کی بات ہے کہ بڑی خوشی ہوئی۔ کافی دیر تک یہ سہانی خوش فہمی ہمارے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں رس گھولتی رہی۔ اور پھر جو تیسرا خیال آیا تو نہ صرف خیال ہی تکلیف دہ تھا، پورے گھر کا منظر بھی تکلیف دہ وہ چکا تھا۔ یعنی ہمارے گھر والی صحن کے درمیان بھوں بھوں کر کے روتی جا رہی تھی اور باقی اہل خانہ اُسے منانے اور تسلی دینے کے فنی اور تکنیکی کام پر لگا ہوا تھا۔ ہمیں

Marfat.com

حالات کی نزاکت کا احساس ہوا۔ معاملہ کافی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ کسی دشمن روسیاہ نے ہماری دوسری شادی کی ہوائی نمک مرچ لگا کر اڑا دی تھی۔ سچی بات ہے کہ دل دہل گیا۔ گھر برباد الگ ہوا۔ اور پریشانی مفت کی۔ پہلی شادی تو ماں باپ نے خاندانی روایت کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے خرچ پر کرادی تھی۔ اب خدانخواستہ واقعی شادی کرنے کی افتاد سر پر پڑی تو ساری عمر ''چھڑے'' ہی گذارنی پڑے کہ اولاً تو رشتہ کوئی دینے کا نہیں اور اگر کوئی عقل کا اندھا دھوکہ کھا بھی بیٹھا تو نکاح اور رخصتی اپنے خرچ پر ممکن ہی نہیں۔ نہ پیسہ ہوگا۔ اور نہ ہم ایک عدد بیوی کے مالک بن سکیں گے۔ پھر والد صاحب محترم کی طرف سے یہ یقین بھی واثق کہ وہ ناخلف قرار دیتے ہوئے اخبارات میں اشتہار بھی دلوادیں گے کہ میں نے اپنے منجھلے لڑکے کو اُس کی ناپسندیدہ حرکات کی وجہ سے تمام جائیدادِ منقولہ و غیر منقولہ سے عاق کیا اور آئندہ اس کے کسی عمل کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہ ہوگی۔ جوں جوں سوچتا جارہا تھا پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ بالآخر جمگھٹا دیکھ کر ہماری سپاہیانہ لیڈر شپ عود کر آئی اور ہم نے سب کو Motivate کرنے کا تہیہ کرلیا ہم صحن میں ایک شان استغناء کے ساتھ چلتے ہوئے ''جائے وقوع'' پر پہنچے اور گلا صاف کر کے تمام لوگوں سے پروقار طریقہ سے مخاطب ہوئے۔

''جیسا کہ آپ تمام جانتے ہیں کہ اس گھر کی بہو دلہن نے مجھ پر یہ الزام لگایا ہے کہ میں نے ایک عدد فالتو بیوی پال رکھی ہے۔ یہ سراسر غلط ہے۔ اور میں دلیل کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کسی نے یہ لگائی بجھائی محض میرا گھر برباد کرنے کے لئے کی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ایک بیوی اور اس کے لوازمات (بچے اور بچیوں) کا خرچہ تو بڑی مشکل سے چلتا ہے۔ دوسری بیوی لانے کا خطرہ مول لے کر قحط کا سامنا کرنے کے لئے میں بالکل تیار نہیں۔ آپ میں سے کون بتائے گا یہ ساری شرارت کس کی ہے؟'' اپنی مقفع و مسجع تقریر ختم کرنے پر ہم محسوس کر رہے تھے کہ آرمی سکول آف ایجوکیشن میں تیار کی ہوئی

Marfat.com

ٹی پی اور آئی پی کے الفاظ بہت کام دے رہے تھے۔ کیونکہ ''جیسا کہ آپ جانتے ہیں'' قسم کے الفاظ ہم نے ٹی پی سے ہی رٹے تھے اور طریقہ تدریس کے اصولوں کے عین مطابق ہم نے سوال کر کے پورے مجمع کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا مگر جواب دینے کے لئے ہاتھ کھڑے کرنے کی بجائے سب لوگ ہم پر برس پڑے چونکہ بہت سی آوازیں باہم گڈ مڈ ہوگئی تھیں اس لئے کچھ سمجھ نہ آیا کہ سب ماں بہنیں اور بھاوجیں مل کر ہم سے کیا مطالبہ کر رہی ہیں۔ بہر حال کچھ گالیاں، کچھ کوسنے اور چند بد دعائیں ہمارے پلے پڑ گئیں۔ بالآخر ہماری والدہ ماجدہ کی گرجدار آواز گونجی اور کچھ فقرے غصے میں بولے جن کا مطلب تقریباً یہی بنتا تھا کہ ہم نے اپنی چچا زاد بیوی میں کیا خامی دیکھی تھی کہ سہرے باندھ لئے اور پھر خاندانی روایات کو تار تار کر کے بزرگوں کی اجازت کے بغیر ہم نے جو جرم کیا تھا وہ بہر صورت گردن زدنی تھا۔ ہماری ماں جی نے انکشاف کیا کہ ہم لاکھ چھپائیں ہماری دوسری شادی کے انتظام اور انتظام پر ٹھاٹ باٹ کے اہتمام کی ساری کہانی کا انہیں عطا کی زبانی پتہ چل گیا ہے۔ بلکہ اس نے ہمارے روزمرہ کے معمولات کا ایک ایک لمحہ تفصیل سے ہماری نیک بخت کو بتایا ہے۔ عطا کا نام سن کر ہم اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اسی رگڑے جھگڑے میں رات کے ساڑھے دس کا عالم ہو گیا گھر میں پٹنا پڑی ہوئی تھی جب عطا بھی قہقہے لگاتے ہوئے اندر آگئے وہ سارا ڈرامائی منظر بیرونی دیوار پہ چڑھ کر دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے سارے گھر کو یقین دہانی کرائی تو ہماری جان چھوٹی وہ بھی اس طرح سے کہ اپنے پیاروں کی جانوں کی قسم کھا کھا کر انہوں نے بتایا کہ میں نے تو محض مذاق کیا تھا۔

Marfat.com

حسرت کی شاعری اور ہم

معزز حاضرین! مولانا حسرت موہانی کی روح آج یقیناً تڑپ رہی ہوگی۔ کیونکہ آج نیشنل سنٹر کے ملک بھر میں پھیلے ہوئے مراکز میں میری طرح کے کئی ان پڑھ دانشور حسرتؔ کی شاعری کو چارہ سمجھ کر اپنا اپنا راانجھا راضی کر رہے ہوں گے۔ اس لئے چند معروضات پیش کرنے سے قبل میں حسرت کی روح سے ادب کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں۔ اور حاضرین کرام یہ معافی میں آج اس لئے بھی مانگ رہا ہوں کہ "آ بیل مجھے مار" کے مصداق نام نہاد دانشوری کی یہ مصیبت بھی میں نے اپنے گلے میں خود ڈالی ورنہ نیرؔ سرحدی اور محترم مروت صاحب تو مجھے ایک باقاعدہ اور باوقار سامع کے طور پر ہی بلانا چاہتے تھے مگر ہائے رے چاہت کے ارمان اسٹیج پر آنے کی مصیبت کو ہم نے خود دعوت دی اور ان حضرات بست وکشاد سے برائے نمود ہی کہہ ڈالا کہ ہم اسٹیج پر آ کر حسرتؔ موہانی پر مضمون بھی پڑھ سکتے ہیں ہماری اس رضا کارانہ پیشکش پر مروت صاحب نے صرف کرسی سے اچھل کر نعرے بازی نہیں کی ورنہ ان کی کیفیت بالکل وہی تھی جو اچانک بٹیرا پکڑ لینے پر اندھے شخص کی ہوتی ہے۔ یہاں تو نیشنل سنٹر والوں کو سننے والا کوئی نہیں ملتا چہ جائیکہ اسٹیج پر آ کر بولنے والا ایک رضا کار مل جائے اندھے کو کیا چاہئے دو آنکھیں۔ لہٰذا سامعین کرام اس وقت جو میری ٹانگوں پر کپکپی اور آواز پر رعشہ طاری ہے اور آپ میری اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، یہ میری اپنی خرید کردہ ہے اور مجھے اس کمزوری کی معافی مانگنا ہے۔ حاضرین کرام! ایک طویل مدت سے میں نے اپنی عقل سلیم اور علم کے درمیان ایک حد فاضل قائم کر رکھی ہے۔ سمجھوتہ یہ

Marfat.com

طے پایا کہ علم کبھی اپنی چار دیواری پھلانگ کر ہماری عقل کے ہاں نہیں آ دھمکے گا۔ اور نہ کبھی عقل بی بی چادر اور چار دیواری عبور کر کے علم کے احاطے میں جائے گی۔ اس سمجھوتے پر دونوں شریف شہریوں کی طرح عمل پیرا تھے اور ہم نے بھی ہر دو سے مخلص ہونے کی بناء پر سطر و حجاب کا ہمیشہ خیال رکھا اور عقل و علم کو کبھی یکجا نہ ہونے دیا۔ بس گیدڑ کو جب موت آتی ہے تو وہ شہر کو بھاگتا ہے۔ اس محاورے کے مطابق مجھے موت تو اسی دن آ گئی تھی جب میں نے اس ہیجڑہ نما شہر میں قدم رکھا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ نیشنل سنٹر کے پڑھے لکھے لوگوں سے دوستی کر لی اور پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ اسٹیج پر آ کر ادبی بڑھک مارنے کی پیشکش بھی کر دی۔

نیر سرحدی نے میرے ساتھ مزید ظلم یہ کیا کہ دعوت نامے کا سائیکلو سٹائل نکالتے ہوئے نہ صرف مجھے مائی کا مادھو یعنی مہمان خصوصی لکھ ڈالا بلکہ میرے نام کے آگے شاعر و ادیب کا اضافہ کر کے مجھے میری اوقات کے جامے سے باہر نکالنے کی مذموم کوشش بھی لگا دی۔ کسی شخص کو بر خود غلط خوش فہمی اور نرگسیت میں مبتلا کرنا ہو تو اُسے نیر جیسے بندے کے حوالے کر دیجئے یہ بندہ گردن میں سریا ٹھوک کر اسے خدا بنا دے گا۔

حقیقت یہ ہے حضراتِ گرامی کہ مولانا حسرت موہانی کے بارے میں اپنا نقد علم صرف اتنا ہے کہ ایک سفید ریش عینکوں والے حیران و پریشان قسم کے بابا جی تھے جو ایک طرف سیاست کے پھٹے میں ٹانگ اڑائے رکھتے تھے تو دوسری طرف فارغ اوقات میں شغل عشق فرماتے ہوئے ہر سچے عاشق کی طرح شعر و شاعری بھی کرتے۔ اور یہ کہ انہیں چکی پیسنے کا بڑا شوق تھا۔ اور چکی چلاتے ہوئے وہ شعر بھی گنگنا لیتے تھے بالکل اسی طرح جیسے ہم میں سے اکثر لوگ غسل خانے میں داخل ہوتے ہی شام چوراسی گھرانے کے ممبر بن جاتے ہیں۔ حسرت موہانی کے بارے میں ہماری معلومات کا ماخذ ہمارے وہ دوست تھے جو دشت الفت میں نئے نئے داخل ہوئے تھے اور ایک دفعہ ٹھنڈی ٹھنڈی آہوں کی

Marfat.com

آمیزش کر کے انہوں نے حسرت موہانی کی معاملات عشق والی وہ وارداتی غزل سنائی تھی۔ جس میں باباجی مرحوم ومغفور کا محبوب کبھی عزفے سے تاک جھانک کرتا ہے۔ کبھی انگلی دانتوں میں دباتا ہے اور جب باباجی پردے کا کونہ کھینچتے ہیں تو محبوب دوپٹے سے اپنا منہ چھپالیتا ہے۔ کبھی غیروں سے نظریں بچ کر اور اہل خانہ کی مرضی کے خلاف اندھیری راتوں میں باباجی کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ ساعت وصل فراق کی گفتگو کر کے محبوب زاروقطار روتا ہے اور ساتھ بزرگوں کو بھی رلاتا ہے۔ کبھی کبھی عین دوپہر میں باباجی کو بلانے کے لئے محبوب ننگے پاؤں کوٹھے پر چلا آتا ہے۔ وہی غزل۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے

حاضرین کرام! یہ غزل سننے کے بعد آپ یقین کریں کہ مولانا موہانی کو پڑبابا جی کہنے کو جی چاہا۔ کیونکہ جس قسم کے مشکل عشق کا ذکر انہوں نے غزل میں کیا ہے، وہ ہمارے دادا جان بلکہ ان کے بھی والد صاحب کے زمانے میں رائج تھا۔ ہمارے دور کا عشق تو بڑا سہل انگار اور سرعت پذیر ہے۔ ٹیلی فون پر ہیلو ہیلو ہوئی۔ راندے دیاں مقرر ہوئی اور ملاقات ہوگئی۔ نہ عزفے کی تاک جھانک، نہ کوٹھوں کی اچھل کود اور پھلانگ دوپٹہ ویسے ہی جاتا رہا تو پھر پلو میں منہ چھپالینے کی عادت چہ معنی دارد۔ جب ٹیلی فون پر ڈیٹ اور ٹائم کا تعین ہو جائے تو پھر اہل خانہ سے چھپ چھپا کے ملنے کا مسئلہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ کوٹھوں اور محلوں کے تذکرے داستان پارینہ بن گئے ہیں۔ آج تو کوٹھیوں کے بڑے بڑے لان ہیں۔ باہر کے گیٹ سے لے کر مکان کے کاریڈور تک کسی اجنبی کا چلے آنے قطعی غیر اخلاقی بات نہیں۔ جب لان میں ہی نامہ و پیام کا مرحلہ بحسن وخوبی طے ہو جائے تو پھر کیسے کوٹھے اور کہاں کا ننگے پاؤں اور دبے پاؤں چلنا چنانچہ باباجی کا عشق ہمیں سمجھ نہ آیا۔ اور ہم نے بڑے ادب سے پڑباباجی کو سلام کر کے عقل اور علم کے درمیانی فاصلوں کو تھوڑا اور کھینچ دیا۔

Marfat.com

حاضرین گرامی! حسرت موہانی پر چند علمی موشگافیوں سے پہلے میں ایک گذارش اور بھی کرنا چاہتا ہوں۔ جس دن سے میں نے مروت صاحب کو ٹیلی فون پر بزعم خود حسرت موہانی پر ٹاک دینے کا وعدہ کیا ہے، میرے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے ہیں۔ اور مجھے ہلکا ہلکا بخار آ جا رہا ہے۔ اور اس ساری صورت حال کی وجہ یہ ہے کہ جس دن سے نیشنل سنٹر والوں سے وعدہ کیا ہے، میں نے حسرت پر مبلغ پندرہ عدد کتابیں جن کا نصف مبلغ پاؤ کم آٹھ کتابیں بنتا ہے، پڑھ ڈالی ہیں مگر اپنا علم کم بخت عینکوں والے بابے سے ایک انچ آگے نہیں بڑھا۔ میری صرفی ونحوی قابلیت ویسے ہی بچپن سے تھوڑی بیمار شمار رہی ہے۔ اس لئے میری گفتگو کے دوران اگر کہیں آپ کو عربی، فارسی، ہندی اور سرائیکی کے تراکیب ومصدار باہم دست وگریباں ہوتے نظر آئیں تو معاف کر دیجئے گا۔ حساب کتاب میں میرا ایمان کافی مسلمان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میٹرک پاس کر لینے کے باوجود مجھے عاد اعظم کے سوال نہیں آتے تھے۔ لہٰذا پندرہ کا نصف اگر میں پونے آٹھ بتاؤں تو بالکل جائز ہے۔ آخر کتابوں کے دیباچے، تبصرے اور فلیپ کا وزن بھی تو کسی کھاتے میں ڈالنا ہے۔

حاضرین محترم! حسرت موہانی کی زندگی سیاست اور ادب کے متضاد خانوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ساری عمر سیاست میں یکا وتنہا اپنے مکتب فکر کے وادح سپاہی بن کے چومکھی لڑتے رہے۔ ان کے ادب کی داستان بھی کچھ اسی قسم کی ہے۔ ان کے ادب کا مجموعی تاثر کچھ ایسا بنتا ہے جیسے دینائے شعر کا کوئی نیرو اپنے اردگرد کے ماحول سے بے خبر شعر ونغمگی کی بانسری پر جمالیات کی میٹھی سروں میں مستی الاپ رہا ہو۔ ان کی عشقیہ شاعری میں سیاست کے کھکھیڑوں سے بھرپور ان کی ذاتی زندگی کا کوئی عکس نہیں ملتا۔ ان کی رومانی شاعری کو اس صاف شفاف آبشار کے پانی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو نغمے الاپتا، اچھلتا کودتا اپنے منبع سے نکل کر کوہساروں کے تنگناؤں سے

Marfat.com

گذرتا ندی نالوں کی شکل اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ معاملہ بندی اور واردات کے بیان میں جو کمال اور انفرادیت مولانا حسرت موہانی کو حاصل ہے، وہ نہ تو اُن سے پہلے شعراء میں سے کسی کو حاصل تھی اور نہ آنے والے دور کے کسی شاعر کو نصیب ہوئی۔ معاملہ بندی ایک روایتی اور فرسودہ طرزِ مضمون تھا۔ حسرت سے پہلے جن شاعروں نے معاملہ بندی کو اشعار میں آزمایا، وہ ابتذال، لچرپن اور سوقیانہ پن کی طرف مائل ہو گئے۔ وہ معاملات میں ایسی ایسی واردات کا ذکر لے آتے جن کا تذکرہ کسی سنجیدہ صحبت میں ممکن نہیں۔ لیکن حسرت کی معاملہ بندی میں جذباتی حقیقت تخیل کے ساتھ اس طور پر ہم آہنگ ہوئی ہے کہ سامع شعر میں ایک مخصوص تازگی، شگفتگی اور لطف محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حسرت کے محبوب کی شوخیاں انتہائی نجی زندگی کی معصومیت سے آراستہ ہیں۔ انہوں نے اپنے اشعار میں بعض خوب صورت معاملات کو جس خوش اسلوبی سے سمیٹا ہے اگر کوئی دوسرا ہوتا تو یقیناً گھٹیا پن اور پستی کا شکار ہو جاتا۔ اسے حسرت کے جذبے کا اعجاز کہیے کہ معاملہ بندی اور واقعہ گذاری میں بھی اُن کے لب و لہجے کی معصومیت برقرار رہی جب معصومیت کا ذکر آتا ہے تو حسرت کی بڑی بڑی اور پھٹی پھٹی آنکھوں کا خیال آجاتا ہے۔ جن میں تحیر اور معصومیت جھولنے جھول رہی ہوتی ہے۔ یہ پھٹی پھٹی اور متحیر آنکھیں عشق و محبت کی اس منزل کی طرف اشارے کرتی نظر آتی ہیں جہاں انسان کے لئے فطرت نے دائمی مسرت کے خزانے چھپا رکھے ہیں۔ کیفیت کی فراوانی ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں۔

بزم اغیارِ میں ہر چند وہ بے گانہ رہے
ہاتھ آہستہ میرا پھر بھی دبا کر چھوڑا
دیکھا جو کہیں گرم نظر بزم عدد میں
وہ ڈانٹ گئے مجھ کو برابر سے گذر کر

Marfat.com

راہ میں ملئے اگر مجھ سے تو ازراہِ ستم
ہونٹ اپنا کاٹ کر فوراً جدا ہو جایئے
مجھ سے تنہائی میں گر ملیئے تو دیجے گالیاں
اور بزمِ غیر میں جانِ حیا ہو جایئے

مولانا حسرت کے ہاں عشق کا سیدھا سادہ انداز ملتا ہے۔ ان کا محبوب کوئی خیالی یا تصوراتی محبوب نہیں کہ وہ آسمانی محبت کی عرفانی جھلکیوں سے ان کی آنکھیں خیرہ کرتا ہو۔ وہ میر کی طرح مجاز کی حد سے آگے بڑھنے کے دعویٰ دار نہیں ہوئے کہ یہی اُن کے نزدیک اصل حقیقت ہے ان کا جذبہ اور تخیل ایک محسوس حقیقت سے وابستہ ہے جو نسوانی حسن کا مجسمہ ہے یہی وجہ ہے کہ اُن کے اشعار میں چلتے پھرتے محبوب کا ناز و انداز بھی حقیقی ہے۔ حسرت کو اپنے اندرونی جذبات اور ذاتی تجربوں پر پورا اعتماد ہے۔ انہوں نے اپنے تغزل کو شعریت کے سوا کسی خارجی محرک سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے جذبات اور تصورات کے درمیان واضح فرق قائم رکھا تصورات کو شعر کا جزو کبھی نہ بننے دیا۔ حسن و عشق کی نفسیات پر اُن کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔ اِن اشعار پر اُردو غزل جتنا ناز کرے کم ہے۔

بے زبانی ترجمانِ شوق بے حد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں
التفاتِ یار تھا اِک خوابِ آغاز وفا
سچ ہوا کرتی ہیں اِن خوابوں کی تعبیریں کہیں
نگاہ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ کیوں نہ خوبیٔ قسمت پہ اپنی ناز کرے
دلوں کو فکر دو عالم سے کر دیا آزاد

Marfat.com

تیرے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے
کس درجہ پشیمان ہے تاثیر وفا میری
اس شوخ پہ آتا ہے الزام پشیمانی
دیکھ اے ستم جاناں یہ نقش محبت ہیں
بنتے ہیں بہ دشواری مٹتے ہیں بہ آسانی

آخر میں حاضرین کرام ایک حقیقت کا اعتراف بھی کرتا چلوں۔ بزرگِ محترم حسرت موہانی بوڑھے تھے، کمزور و پریشاں حال تھے۔ عینکوں والے بابے تھے مگر ہم سے بدر جہا بہتر تھے کہ عمر بھر اک محبوب کی پاکباز محبت کی حشر سامانیوں سے نشاط کے مزے لوٹتے رہے اور وہ بت اصلی اُن کے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں آہو کی طرح کلیلیں بھرتا رہا۔ لیکن ایک ہم ہیں کہ عین جوانی میں ایک عرصے تک نگار خانہ دِل سجا کر اور آنسوں کے دیئے جلا کر بیٹھے رہے ہیں۔ اور قسمت ایسی پھوٹی کے سیم اور تھور نے تو عقل سلیم کے بالا خانے پر قبضے جما لئے مگر کسی پری جمال نے آج تک نگار خانۂ دِل میں جھانکنے کی کوشش نہ کی۔ تو بتائے ہم اچھے ہوئے کہ حسرت؟

(پاکستان نیشنل سنٹر ڈیرہ اسمٰعیل خان میں "یوم حسرت" پڑھا گیا)

Marfat.com

بال کی کھال

بال کی کھال اُتارنا اُردوزبان کا محاورہ ہے۔اسے میری علمی غربت کہیے کہ جب تک ناقدین ادب اور مبصرین کرام سے میری دوستی نہیں ہوئی تھی تو میں یہی سمجھتا رہا کہ یہ صرف علمی اصراف ہے اور دلی لکھنؤ والوں نے زبان کو چسکیلا اور پیچیدہ بنانے کے لئے یہ محاورہ گھڑ لیا ہوگا۔ورنہ منطقی طور پر اپنے معنی کے ساتھ اس کی کوئی مناسبت نہیں ہے۔پھر قسمت اس طرح پھوٹی کہ ایک نقاد میرے دوست بن گئے۔طبیعت میں اس محاورے کی ٹوہ تو موجود تھی۔چنانچہ اُن سے پوچھ بیٹھا کہ حضرت تعلیم کی کمی ہے۔آپ دانشور ہیں ذرا اس محاورے پر روشنی تو ڈالئے۔فرمانے لگے یہ دراصل ارسطو کی ایجاد ہے۔انسانی تہذیب کے ابتدائی ادوار کا اگر ہم مطالعہ کریں تو پتہ چلے گا کہ ارسطو وہ پہلا محقق تھا جس نے بال پر چڑھی ہوئی کھال کا برسوں مشاہدہ کیا اور پھر اس پر پُرمغز مقالہ لکھا۔پھر موصوف نے بال کی کھال اُتارنے کی عملی تفسیر بیان کرتے ہوئے معروف شعر پڑھا۔

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

یہ میری بدنصیبی ہے کہ میں اپنی کچھ گذرنے کی عمر میں غلط سوسائٹی کے ہتھے چڑھ گیا یعنی دانشوروں کی منڈلی میں جا پھنسا محاورے کی کھوج میں حالت یہ ہوئی ہے کہ میں سہما سہما اور ہراساں ہراساں رہتا ہوں۔منہ سے لفظ نکالتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ کہیں گرائمر کے دروبست میں غلطی نہ کر جاؤں۔میرے فقروں کی گھاڑت نہ بگڑ جائے۔الفاظ کا بے جا استعمال نہ کر بیٹھوں۔کہیں جزئیات میں پڑ کر میرا بیان اپنی مقصدیت نہ کھو

Marfat.com

بیٹھے۔ میرے طرزِ احساس میں جدت وندرت کی بجائے کلاسیکیت اور روایت داخل نہ ہو جاوے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے دانشوروں نے اپنے رنگ مجھ پر چڑھانے شروع کئے ہیں میں کوئی بھی تخلیقی کام نہیں کر پایا۔ میں بال کی کھال اُتارنے والے محاورے کی تحقیق میں نکلا تھا۔ اس دوران دو حادثے میرے ساتھ ہو گذرے۔ پہلا سانحہ تو یہ ہے کہ دور کہیں کوئی بچہ اگر بلک بلک کر رو رہا ہو تو میں اس کے درد سے طرز احساس اور عصری تقاضوں کی ہم آہنگی تلاش کرنے لگ جاتا ہوں اور خود کلامی مجھ پر طاری ہو جاتی ہے۔ شائد یہی وجہ ہے کہ آج کل میرے گھر میں صدقہ وخیرات کی فصل اتری ہوئی ہے۔ بال کی کھال کا دوسرا کمال یہ ہے کہ بزرگوں کی طرف سے جھاڑ پھٹک اور ڈانٹ ڈپٹ کے ہفتہ وار کوٹے میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جب میرے کوئی بزرگ مجھے سامنے اٹن شن کھڑا کر کے کھری کھری سنا رہے ہوتے ہیں تو میرا دماغ اور کان اُن کی قوت اظہار کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اُدھر سے نصیحتوں کا سیل رواں بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ اور ادھر ہی طرز احساس، فقروں کی چستی، زبان پر دسترس، لفظی انتخابات، زورِ بیاں، پیرائیہ اظہار اور مرکزۂ خیال کی فلم چل رہی ہوتی ہے۔ نصیحت ختم ہوتی ہے۔ تو میرے پاس تنقید کا ایک معقول ذخیرہ موجود ہوتا ہے مگر یہ یاد نہیں رہتا کہ وہ کس بات پر ناراض ہوئے تھے۔ لہٰذا دوبارہ غلطی کرتا ہوں۔ دوبارہ جھاڑ پڑتی ہے اور میں دوبارہ ان کی ڈکشن کا تجربہ کرنے کے چکر میں پڑ جاتا ہوں۔ مجھے اپنے ان دانشور دوستوں کے حوصلوں پر رشک آتا ہے۔ جن کی عمریں ایسی ہی گھریلو جھاڑ وجھپاڑوں...... میں خرچ ہو گئیں مگر ہمت دیکھئے کہ بال کی کھال اُتارنے کا لپکا نہ گیا۔

انشائیہ تو جو ہے سو وہ ہے۔ مگر اس کسب کھال کھینچی میں کئی بوڑھے بڑے خفقانِ قلب کا شکار ہو گئے ہیں۔ انشائیہ کیا ہوا، گویا اندھوں کے ہاتھ ہاتھی لگ گیا ہے اور ہر اندھا اپنا راگ الاپ کر ہاتھی کے وجود کا تعین کر رہا ہے۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ کمزور دِل کے

Marfat.com

لکھنے پڑھنے والے لوگ اس گلی میں جانے سے کتراتے ہیں۔ جہاں لوگ تلواریں لئے کھالیں کھینچے چلے جارہے ہیں۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ دراصل بال کی کھال والا محاورہ گھریلو ضروریات کو مدنظر رکھ کر ایجاد کیا گیا۔ چونکہ عورت کے حقوق غصب نہیں کیے جاسکتے اور اب تو ویسے بھی عورت کمر ہمت باندھ کر مرد کے مقابلے میں آ کھڑی ہوئی ہے۔ اس لئے یہ روایت قرین حقیقت محسوس ہوتی ہے۔ خاوند ویزنے پر دیئے ہوئے وقت سے لیٹ گھر پہنچے تو بیوی کچھ ثقہ قسم کے استفارات کرتی ہے۔ اگر یہ محاورہ نہ ہوتا تو اس تفتیشی عمل کو آپ کیا نام دیتے۔ دفتر سے واپسی پر موٹر سائیکل پر بیٹھنے کی وجہ سے اگر بے چارے خاوند کی زلفیں پریشان ہو جائیں تو بیوی کے دِل میں ہول کے ساتھ ساتھ جواب طلبیوں کے طوفان اُٹھتے ہیں۔

حضرات! بکری کی کھال اتارنے کی طرح بال کی کھال اتارنے میں بھی مہارت کے کئی درجے ہیں۔ نفیس ترین کھال کھینچ نقاد وہ ہوتا ہے جو اپنی تشریحات اور توضیحات سے بعض اوقات ممدوح شاعر کے ذہن میں یہ شک پیدا کردے کہ جس شعر کی بات ہو رہی ہے وہ اس کا تخلیق کردہ ہی نہیں ہے۔ شاعر نے جانے کس ترنگ اور کیسی ذہنی کیفیت کے تحت شعر کہا ہو لیکن مکرم نقاد کو یہ اصرار ہوتا ہے کہ شاعر نے شعر کہنے سے پہلے اس سے مشورہ کیا تھا۔ پھر وہ اپنی مسلط کردہ کیفیت کی وکالت کرتے ہوئے شعر کا تخلیقی پس منظر، ذہنی کیفیت، دل خون ہو جانے کا سانحہ اور پھر اس ساری درد بھری کہانی کے وجود سے شعری تخلیق کا وہ جواز پیش کرتا ہے جو شاید حضرتِ شاعر کے خواب و خیال میں بھی نہ ہو۔ جیسے میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ بال کی کھال اتارنے کے بھی درجے مقرر ہیں۔ اب مثلاً کھال اتارنے کے بعد ترقی کا دوسرا درجہ کھال کھینچنا بنتا ہے۔ یہ درجہ قدرے مشکل بھی ہے اور مہارت طلب بھی۔ اس کی مثال یوں لیجئے کہ جیسے

Marfat.com

ہمارے جفادری نقاد پنجے جھاڑ کر انشائیے کے پیچھے پڑ گئے ہیں ویسے آپس کی بات جس گھر میں بیوی کھال کھینچ قسم کی ہو، وہاں خاوند بھی مسلسل مشق سے بہت بڑا حیلہ ساز، بہانہ جو اور داستان گو بن جاتا ہے۔ اور اکثر بزعم خود کھال کھینچ کر رکھ دینے والی مرد کے غنچے میں آجاتی ہے۔ بیوی ڈال ڈال تو میاں پات پات۔ گھر میں ساس اور بہو کا لڑنا دونوں مسمات کی تاریخی مجبوری ہے۔ کیونکہ گھر کی ساری رونق اسی ایک ہنگامے پر ہی موقوف ہے جھگڑے کی کوئی بنیاد نہیں ہوگی مگر ساس بہو نے اسی بنیاد پر لڑنا ہوتا ہے کہ بنیاد کوئی نہیں۔ اسی بے بنیاد ریت پر عالی شان عمارت کھڑی کرنا ہوتی ہے۔ خود سوچئے کہ اگر یہ محاورہ نہ ہوتا تو ساس اور بہو کے جھگڑے کی ایک مہذب، پڑھی لکھی اور ترقی یافتہ شکل کیا ہوتی ہے۔

Marfat.com

اے بی اشرف، ایک حوالہ

پہلے پہل میرا اس سے تعارف ایک کتاب کی تقریب رونمائی میں ہوا۔ میں جب اس سے ملا تو اس نے اس قدر تپاک سے بچھ کر مجھے ہاتھ ملایا کہ مزید بات چیت کے لئے الفاظ میرا ساتھ نہ دے سکے۔ اس نے صاحب کتاب پر اتنا خوبصورت اور متوازن مضمون پڑھا کہ مجھے اس کی شخصیت کی کھوج لگ گئی اس کے اخلاق اور علم نے میرے دل و دماغ کو متاثر کیا۔ اور میں نے ٹھان لی کہ اس مقناطیسی شخصیت سے انتہائی نجی ماحول میں بات کرنے کا موقع ضرور نکالوں گا۔ پھر ایک دن میں اچانک اس کے گھر جا دھمکا۔ وہ اپنی بیٹھک میں ایک تخت پوش پہ آلتی پالتی مارے ڈاکٹریٹ کی تھیسیس مکمل کرنے پر لگا ہوا تھا۔ وہی خلوص اور انکساری کا وہی عالم جو بعض اوقات دوسرے ملاقاتی کو شرمندہ کر دے۔ اس نے بہ دل و جان میری خاطر تواضع کی۔ مگر اس خاطر مدارت میں بھی خلوص اور بے ریائی کی حلاوتیں شامل تھیں مجھے اس کی بلند شخصیت کی ٹوہ لگی ہوئی تھی۔ چنانچہ روئے سخن بھی اسی جانب پھیر دیا۔ مجھے حیرانگی ہوئی کہ اس کے بیان میں بچوں کی سی معصومیت تھی۔ ان نے میرے سامنے اپنی شخصیت کو غلافوں میں لپیٹ کر پیش نہ کیا۔ بلکہ بلا جھجک کہنے لگا۔

"میں نے عملی زندگی کا آغاز سات جماعتیں پڑھ کر کیا۔ پہلے پہل ممتاز آباد میں روئی کے ایک کارخانے میں روئی کے بورے لکھنے کی نوکری کی۔ دن بھر محنت کرتا اور رات کو مٹی کے تیل کے دیئے میں پڑھائی کرتا۔ یہاں رہ کر میں نے میٹرک پاس کیا۔ جستجوئے منزل نے مجھے چین نہ لینے دیا۔ اور بہتر نوکری کی

Marfat.com

تلاش میں ڈیرہ غازی خان میں لوئر ڈویژن کلرک بھرتی ہو گیا۔ وہاں رہ کر میں نے ایف اے اور بی۔اے کر لیا۔ سیماب پا طبیعت سے مجبور ہو کر میں لاہور چلا گیا وہاں میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ دن کو یونیورسٹی جاتا اور رات کو نوکری کرتا۔ میں نے لاہور میں بڑی پریشانی دیکھی چھوٹی موٹی ملازمتیں ملتیں اور چھوٹ جاتیں مجھے فاقے دیکھنے پڑے۔ لیکن نہ میں نے یونیورسٹی چھوڑی اور نہ حوصلہ ہارا۔ جب سرخرو و کامران ہو کر نکلا تو میرے ایک ہاتھ میں ماسٹر کی ڈگری تھی اور دوسرے میں بے روزگاری پھر مشیت ایزدی میری مدد کو آئی اور میں پبلک سروس کمیشن میں منتخب ہو کر لیکچرار بن گیا۔ میرا حوصلہ بڑھ گیا کہ میں اپنی منزل کو جانے والی سیڑھی پر قدم رکھ چکا تھا پھر وقت آیا میں اسسٹنٹ پروفیسر بن گیا۔ لیکن ابھی مجھے آگے جانا ہے اس لئے ڈاکٹریٹ کر رہا ہوں۔ مجھے تائید ایزدی اور اپنی محنت پر یقین ہے۔ میں نے ابھی آگے جانا ہے۔ انشاء اللہ جاؤں گا۔"

حوصلہ کا علمبردار گفتگو کر رہا تھا اور میری آنکھوں میں احسانِ دانش کی کہانی اُتری ہوئی تھی۔ لیکن عصری تقاضوں کا تضاد دونوں کہانیوں میں موجود تھا احسان دانش کے دور کے لوگ ڈوب ڈوب کر بھی ابھر آتے تھے مگر آج کے دور میں ڈوبا ہوا انسان شاذ و نادر ہی ابھرتا دیکھا گیا۔ اے بی اشرف ڈوب ڈوب کر بھی آج کے دور میں بار بار ابھرتا رہا۔ اب اس کا ستارہ رو بکمال ہے۔ وہ بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی میں شعبہ اُردو کا سربراہ ہی نہیں، تین کتابوں کا مصنف بھی ہے۔ اس کے تین درج سے زائد مضامین فکر و فن پاک و ہند کے مؤقر ترین رسالوں مں ے چھپ چکے ہیں۔ ادبی حلقے اے۔ بی اشرف سے بخوبی واقف ہیں مگر اس شخصیت کا پس منظر عظیم تر ہے۔

اے۔ بی اشرف عمری تضاد کے باوجود آج میرا یار ہے۔ یار بے ریا ہے جہاں

Marfat.com

میں نے زندگی کے کئی حوصلہ مند قرینے اس سے سیکھے ہیں وہاں اس کی دوستی نے میری زندگی کے بعض فکری اور معاشرتی پہلوؤں کو بھی متاثر کیا ہے۔ صرف چند پہلو میں بیان کروں گا۔ میری جہالت اور کم علمی کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ ایک احسان یہ ہے کہ میں شعر و ادب کو تضیع اوقات کا معقول ذریعہ سمجھتا ہوں۔ ادیب تخیل کے دوش پر سوار ہو کر ذہنی طور پر صدیوں کی طنابیں کھینچ ڈالتا ہے۔ مگر حقیقت میں وجودی اعتبار سے اپنے اردگرد کی گھمبیرتا اور معاشرے کی سلگتی ہوئی سنگینیوں میں ہی سانس لے رہا ہوتا ہے یعنی

تخیل کے کرشمے ہیں، بلندی ہے نہ پستی ہے

اگر کوئی بحث کرتے ہوئے مجھے علامہ اقبال کی طرف لے جائے تو میں کہتا ہوں کہ خواجہ معین الدین چشتی کو بھجن گاتی اور راگ الاپتی قوم ملی تو مجبوراً انہیں سرنگیت کو ذریعۂ تبلیغ بنانا پڑا۔ علامہ اقبال کو رگ گل سے بلبل کے پر باندھنے والی قوم سے واسطہ تھا۔ مجبوراً شاعری فرمانا پڑی، یہ بات تمہیداً درمیان میں آ گئی ہے۔ خیر ایک دفعہ دوستوں نے مجھے ورغلا کر عرش صدیقی کا افسانوی مجموعہ پاؤں کفن سے باہر پڑھوا دیا۔ کتاب پڑھ ڈالی اور ایک علامت تک سمجھ نہ پایا۔ یہ وہ دور تھا جب اہل شہر ہاتھوں میں پتھر اٹھائے گلی گلی اور کوچے کوچے عرش صدیقی کو تلاش کرتے پھرتے تھے۔ میرا خبث باطن جاگا تو عرش صدیقی کو میں نے بھی پتھر مارنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن پھر خاندانی شرافت کے کسی سرد خانے سے ایک آدمی نے جمائی لیتے ہوئے مجھے مشورہ دیا کہ عرش صدیقی کے خلاف کچھ لکھنے سے پہلے کسی پڑھے لکھے آدمی سے صلاح ضرور لے لوں۔ میں نے اک دوست سے مشورہ کیا تو اس نے اے۔ بی اشرف کا مضمون ''عرش صدیقی کی افسانہ نگاری'' پڑھنے کو کہا...... یہ مقدمہ پڑھنے کے بعد میں نے عرش صدیقی کے کفن سے باہر نکلے ہوئے پاؤں دو دفعہ پڑھ ڈالے۔ اور ہر دفعہ مجھے ایک نئی کیفیت اور عمیق خیالی کا ادراک ہوا۔ آج میں عرش صدیقی کے ڈکشن اور طرز احساس کا خود کو سکالر محسوس کرتا

Marfat.com

ہوں۔ یہ مہربانی اے۔ بی اشرف کی ہے۔ جس کی تنقید میں تقریباً دو دہائیوں کی محنت و مشقت اور خوب صورت اسلوبِ تلقین و تدریس کا رنگ جھلکتا ہے۔

شعر و ادب کی افادیت کے بارے میں میرا نظریہ وہی تھا۔ جو ایف اے میں پڑھنے والے ایک طالب علم کا میر تقی میر کی فقیرانہ آئے صدا کر چلے جیسی غزلیں پڑھنے کے بعد ہوتا ہے۔ لیکن اے۔ بی اشرف نے ''ادب اور سماجی عمل'' مجھے تھماتے ہوئے وہی لفظ کہے جو کسی مشن کا مبلغ اپنے نئے کیس پر کام کرتے ہوئے اپنا مشنری لٹریچر اُسے دیتے ہوئے کہتا ہے۔ یعنی

''یار یہ کتاب لے جاؤ۔ اسے توجہ سے پڑھو جب تم پڑھ لو گے۔ تو ہم بیٹھ کر اس پر گفتگو کریں گے''۔

میرا مبلغ تو میرے پیچھے ہاتھ دھو کر نہ پڑا۔ البتہ اس کا کیس اس کے گلے میں پڑ گیا ہے۔ جب بھی موقعہ ملے تو افادی ادب کے حوالے سے میں اے۔ بی اشرف سے الجھ پڑتا ہوں۔ وہ پیچھے رہ گیا اور اس دوڑ میں میں اس سے کہیں آگے نکل گیا ہوں۔

جب سے اے۔ بی اشرف سے میری دوستی ہوئی ہے۔ میں سہما سہما اور ہراساں ہراساں رہنے لگا ہوں۔ منہ سے لفظ نکالتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ کہیں گرائمر کے در و بست میں غلطی نہ کر جاؤں۔ میرے فقروں کی ساخت غلط نہ ہو جائے الفاظ کا بے جا استعمال نہ کر بیٹھوں۔ کہیں جزیات میں پڑ کر میرا بیان اپنی مقصدیت نہ کھو بیٹھے۔ میرے طرز احساس میں جدت و ندرت کی بجائے کلاسیکیت اور روایت داخل نہ ہو جائے۔ بس یہی وجہ ہے کہ تب سے لے کر اب تک میں ڈر کے مارے ایک بھی تخلیقی کام نہیں کر پایا۔ خاک کروں اے۔ بی اشرف اور انوار احمد کے ہاتھوں جغادری تخلیق کاروں کی کھال اترنے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں کنواں دیکھنے کے بعد صرف خودکشی کرنے والے کا ہی اتنا حوصلہ ہوتا ہے کہ وہ چھلانگ لگا دے۔

Marfat.com

اے۔ بی اشرف سے دوستی کے بعد میرے ساتھ دو حادثے اور بھی ہو گذرے ہیں۔ پہلا سانحہ تو یہ ہے کہ اگر دور کہیں کوئی بچہ بلک بلک کر رو رہا ہو تو میں اس کے درد سے طرز احساس اور عصری تقاضوں کی ہم آہنگی تلاش کرنے لگ جاتا ہوں۔ جب کسی شریف گھر میں کوئی مردِ جوان روتے ہوئے بچے کو چپ کرانے کی بجائے کاپی قلم لے کر اس کے تاثرات نوٹ کرنے بیٹھ جائے تو گھر والوں کو بدنصیب مرد جواں کی عقل پر کیسے کیسے گماں گذرتے ہوں گے شاید یہی وجہ ہے کہ آج کل میرے گھر میں صدقہ و خیرات کی فصل اتری ہوئی ہے۔ دوسرا حادثہ یہ ہے کہ بزرگوں کی طرف سے جھاڑوں اور ڈانٹوں کا ہفتہ وار کوٹا بڑھتا جا رہا ہے۔ جب میرا کوئی بزرگ مجھے سامنے اٹن شن کھڑا کر کے سرمن (Surmons) سنا رہا ہوتا ہے۔ تو میرا دماغ اور کان اس کی قوت اظہار کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اُدھر سے نصیحتوں کا سیل رواں بڑھتا چلا آ رہا ہے اور اِدھر وہی طرز احساس، فقروں کی بنت، زبان پر دسترس، لفظی انتخاب، زور بیاں، پرایۂ اظہار اور مرکزۂ خیال کی فلم چل رہی ہے۔ جب نصیحت ختم ہوتی ہے تو میرے پاس تنقید کا ایک دقیع ذخیرہ موجود ہوتا ہے مگر یہ یاد نہیں رہتا کہ وہ کس بات پر ناراض ہوئے تھے۔ لہٰذا دوبارہ غلطی کرتا ہوں اور اعادے پر دوبارہ جھاڑ پڑ جاتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں۔ اے۔ بی اشرف کا جگر ہے کہ وہ گذشتہ اٹھارہ، بیس برس سے جھاڑوں اور پھٹکاروں کے عمل سے گذر رہا ہے مگر آج تک چہرے پر ملال تک نہیں لایا۔ پھر اے بی اشرف کا یہ بھی تو المیہ ہے کہ اس کا بزرگ کوئی نہیں وہ اپنا بزرگ خود ہے۔ گھر میں لے دے کر ایک بیگم اشرف ہی تو باقی رہ جاتی ہیں جنہیں بزرگی اور جھاڑ جھپاڑ کا غیر پسندیدہ فریضہ ادا کرنا ہوتا ہوگا۔ لیکن ایمانداری کی بات ہے کہ اے بی اشرف جب بھی اپنے دروازے سے باہر آیا ہے، میں نے اس کا چہرہ ہمیشہ کھلا گلاب پایا ہے۔ اس کی رنگت اور اس کے گیسو کبھی اندرون خانہ ۹ ہو گذرنے والے افسانے کی روداد نہیں سناتے۔ یہ بہت حوصلے اور ہمت کی بات ہے۔

Marfat.com

میں نے شائستگی و تہذیب کے قواعد و ضوابط کے خلاف اے بی اشرف جیسی معتبر شخصیت کے لئے صیغۂ واحد استعمال کیا ہے۔ دراصل کبھی کبھی میری کسی کمزوری کو پکڑنے کے بعد اے بی اشرف مسکراتے ہوئے مجھے اس قدر کھل کر آنکھ مارتا ہے کہ میں بے بس ہو جاتا ہوں۔ آج وہ بے بس ہے اور میں صاحب اختیار مسلمان ادھار چکانا نہیں بھولتا ویسے بھی خلوص، پیار اور عقیدت کی زبان سپاٹ اور غیر شائستہ ہی اچھی لگتی ہے۔

(اُردو اکیڈیمی کے اجلاس میں پڑھا گیا)

Marfat.com

جوانی کا آخری سال

تیس برس زندگی کا ایک بڑا حصہ بنتے ہیں۔ یہ تیس برس ورق ورق بکھرے گذرے لمحوں کی داستانیں سنا رہے ہیں۔ ویران ماضی کی چند یادیں آج دامن دل سے لپٹ لپٹ کر رو رہی ہیں۔ میں اک مہمیز پر کھڑا ہوں۔ اک دور میرے پیچھے کسی کچی دیوار کی طرح ٹوٹ کر بکھرا پڑا ہے۔ جب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو آرزوؤں اور تمناؤں کے اداس اداس مقبرے اور مزار مجھے بالکل ایسے نظر آتے ہیں، جیسے دھند زدہ اور کہر آلودہ شاموں میں شاہی مسجد کے مینار سے شہر کی عہد گزیدہ مسجدوں کے گنبد۔ آج میرے دل میں عجب سا درد اٹھا ہے۔ سیلابی پانیوں کی زبان لمبی اور کاٹ دار ہوتی ہے۔ میں نے سیلاب کو دیکھا ہے کہ کس طرح وہ فلک بوس دیواروں کو چاٹ کر اوندھے منہ گرا دیتا ہے۔ دنیائے دل میں آج تاسف اور قنوطیت کا زوردار سیلاب آیا ہوا ہے۔ تڑپ اور اظہار کی طاقتیں شل ہوا چاہتی ہیں۔ اپنی ادھوری اور اجڑی پجڑی دنیا گھوگھپ اندھیروں میں ڈوبتی نظر آ رہی ہے مگر وائے بیچارگی! ڈوبتی زندگی کو اپنی جیتی جاگتی آنکھوں سے ہاتھ پاؤں مارتے دیکھ رہا ہوں۔ مگر میں اس کے لئے کچھ نہیں کرسکتا کچھ نہیں کرسکتا۔ کچھ نہیں کرسکتا۔ المدد اے یارۂ صبر المدد۔ اور کنی اے چارۂ ضبط ادر کنی...... آج تک میں نے ہونٹوں کو سیا ہے۔ دوسروں کی خاطر زندہ رہنے کی حساس دل کو پہروں نصیحتیں کی ہیں۔ خود کو کھاد بنا کر دوسروں کو پروان چڑھانے کے جتن کئے ہیں۔ لیکن کیا کیجئے، ارمان کا مارا دِل ہی تو ہے۔ جب گئی گذری پر ایک نظر ڈالتا ہوں تو ہزاروں داغ لو دینے لگ جاتے ہیں۔ زندگی اس بھکاری کا روپ لگتی ہے۔ جو سونی اور آسیب زدہ سڑک پر سے مولا کے

Marfat.com

نام پر خیرات کی صدا لگاتا چلا جاتا ہے۔ مگر اسے خیرات دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔ دل آج وہ تہی دست غریب الوطن ہے جو جیب کٹوانے کے بعد سوچتا ہے کہ کس گناہ کی پاداش میں تقدیر نے اسے پردیس میں یہ سزا دی ہے۔ چولہے میں گیلی لکڑی کو سلگتے دیکھتا ہوں تو آنکھوں میں دل کا نقشہ پھر جاتا ہے۔ مظلومیت یہ ہے کہ مجھ میں اظہار کی صلاحیتیں ختم ہو گئی ہیں۔ سوچتا ہوں کہ اپنی داستان کا آغاز کہاں سے کروں اپنے درد کے اظہار کے لئے کن الفاظ کا سہارا لوں؟ اپنے سینے کے داغ دکھانے کے لئے کیا طریقہ اختیار کروں! میری خواہش گونگی ہے اور تمنائیں لکنت گزیدہ۔ چند الفاظ لکھنے کے لئے کئی دنوں سے چھوٹے چھوٹے شذرے لکھتا ہوں اور پھر پھاڑ دیتا ہوں۔ ابھی تک میں ان راہوں کے گمشدہ وجود کا تعین نہیں کر پایا جنہیں میں نے اُمنگوں اور چاہتوں رچے ارادوں کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ کتنا مظلوم ہے وہ انسان جو پیاس سے مرتے ہوئے پانی پانی پکارے مگر اہل خانہ میں سے کوئی اس کی زبان نہ سمجھ پائے۔ میرے دل نے بڑی بھیانک موت پپائی ہے۔ میرے اردگرد غمگساروں اور ہمدردوں کا اک حصار موجود ہے لیکن میری تشنگی کا مداوا کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ کتنی بے چارگی اور بے بسی کی موت ہے۔

جب دل کی کھیتی ویران ہوئی اور زندگی پر فالج گرا۔ تو خود کو زندہ انسانوں کی دنیا کا فرد بنانے کے لئے میں نے ریت کی کیسی کیسی دیواروں کا سہارا لیا۔ اپنے ہمجولیوں میں بیٹھ کر والدین کی خدمت، معاشرتی اونچ نیچ، اخلاقیات اور عمرانیات کے موضوعات پر گھنٹوں کے حساب سے فن خطابت کے جوہر دکھائے کہ شاید کہیں زندگی کے خلاء میں پیوند کاری ہو سکے۔ لیکن تنہائی کے احساس نے منہ پہ تھپڑ مار کے اس بناوٹی خول سے نکل جانے کی تلقین کی۔ اچھا ستھرا اور فیشن ایبل لباس پہن کر اپنی وضع قطع بے فکرے اور زندگی سے بھرپور نوجوانوں کی سی ڈھالنے کی کوشش کی۔ لیکن تنہائی نے ہمیشہ مجھے ننگا کر کے جھوٹے بہلاؤں کا سہارا لینے سے منع کیا۔ کسرتیں اور ورزشیں بھی کر دیکھیں۔ مگر تھک

Marfat.com

ہار کے چارپائی پر اوندے منہ لیٹ جانے سے دامن دل کے چاک رفو نہ ہو سکے۔ محفلوں میں بیٹھ کر کھنکتے ہوئے قہقہے بھی لگا دیکھے مگر ضمیر نے ان کچی اور بے سایہ دیواروں کا سہارا لینے سے منع کر دیا۔ اس طرح اپنے اندر کے لق و دق صحرا میں یکا و تنہا میں موسموں کی جھلستی ہوئی شدتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ جب شعور بلوغت کی ابتدائی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو میں ہر صبح کا آغاز اس خواہش کے ساتھ کرتا کہ اے کاش کوئی تو ملتا جو میرے دل کی زبان سمجھ لیتا۔ اے کاش! کوئی تو ہو جسے فگار سینہ دکھا کر مرہم کی توقع کر سکوں۔ لیکن اس وقت امیدوں کی چاندنی دھندلائی نہیں تھی، ہمت کے قویٰ مضبوط تھے۔ دن گذر جاتا، شام کو مایوسی کا ہلکا سا جالا دل و دماغ پر چھانے لگتا تو ہمت بڑھ کر مدد کو پہنچتی اور دوسرے دن کا سورج میری اجلی خواہشوں کا منہ دُھلا کر طلوع ہوتا۔ اب میری ہمت بھی دم توڑ گئی ہے۔ آخر کب تک کوئی حالات کے جھٹکے سہ سکتا ہے۔ بہاروں کی منزل حاصل کرنے کے لئے خوش فہمی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ آج خوش فہمی کے لاشے کو میں دفنانا چاہتا ہوں۔ حسرتوں کے اجڑے دیار میں اک اور قبر کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ آج میرا شعور بالغ ہے۔ آج احساس پر جوانی ہے۔ میں خوش فہمیوں، جھوٹے بہانوں اور بناوٹی سہاروں کی دنیا سے باہر نکل رہا ہوں۔ آج میں زندگی کے سامنے ہاتھ کھڑے کر کے اپنی شکست کا اعتراف کرتا ہوں۔ آج مجھے اپنے ان احباب سے اپنی تصنع اور منافقت کی معذرت کرنا ہے جن میں بیٹھ کر میں نے اخلاقیات اور عمرانیات پر گھنٹوں لیکچر پلائے مجھے اپنے احساس سے بھی معافی مانگنا ہے۔ جسے دھوکہ دینے کے لئے میں نے بیسیوں بہروپ بھرے اور سوانگ رچائے۔

تیس برس زندگی کا اک بڑا حصہ بنتے ہیں۔ میرے سر پر چند گنے چنے بال باقی رہ گئے ہیں۔ جب زمین بانجھ ہو جائے تو سیم اور تھور بڑی جلد عود کر آتے ہیں میرے باہمت قویٰ بھی آہستہ آہستہ ڈھیلے پڑ رہے ہیں۔ چہرے سے زندگی کی روشن علامتوں کے

Marfat.com

نقوش ایک ایک کر کے مٹتے جا رہے ہیں۔ آج میں اک ایسے مقام پر کھڑا ہوں جہاں سے آگے ڈھلوان شروع ہوتی ہے۔ اور چند قدم بعد اک برف خانہ ہے جس میں بڑھاپا اونگھ اونگھ کر میرا انتظار کر رہا ہے۔ یہ سال میری جوانی کا آخری سال ہے اور میرا اگلا قدم بوڑھاپے کی طرف بڑھے گا۔ مجھے احساس ہے کہ اگلے سال کا سورج میرے لئے زندگی کے یخ بستہ سلیقوں کا پیام لائے گا۔ یہ سلیقے میکانکی انداز میں مستقبل کا فکر کرنے والے معمر آدمی کی سوچیں ہوں گی۔ آج تک جسم و روح کسی عذرا، کسی سلمٰی کی تلاش میں اضطراب و کرب کے جہنموں میں جلتے رہے ہیں اور آج کے بعد انہیں کسی پپو کسی گڈی کی خاطر زندہ رہنا ہوگا۔ میرے ذہن میں شعوری شکست و بے چارگی کا وہ آخری منظر بجلی گرا گیا ہے جب ڈھیلا ڈھالا شلوار کرتا پہنے، چار پانچ بچوں میں گھرا اک بوڑھا انہیں گئے گذرے وقتوں کے کارہائے نمایاں سنا کر دِل و دماغ کے نہاں خانوں میں دفنائی ہوئی جوان حسرتوں کے ایصال ثواب کا بندوبست کرے گا۔ میرے پیچھے مسلسل کشمکش کی داستان بکھری ہوئی ہے۔ آگ اور پانی کے عجیب و غریب امتزاجوں کے المیے اِدھر اُدھر اُلجھے ہوئے ہیں۔ احساس ہمیشہ آگ لگا کر زندگی کو اندھیری راتوں کے جہنم کی نذر کرتا رہا۔ روح محرومیوں کے تھلوں میں پیاس سے ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر ''العطش العطش'' پکارتی رہی اور مادی دنیا دلائل کے حوالے قطرہ قطرہ پانی ٹپکاتی رہی تا کہ روح مرے نہ جینے پائے۔ زندگی کی بھڑکی ہوئی آگ پر غم روزگار کے بہانے سے پانی ٹپکا کر اُسے سلگنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ کرب اور جلن کے قافلے دشتِ تنہائی میں لٹتے رہے۔ مگر؎

کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہئیں

میرے سامنے ایک تیس سالہ وجیہہ نوجوان کی لاش زخموں میں گھری تڑپ رہی ہے۔ وہ خوبصورت لمبا تڑنگا جوان مر رہا ہے۔ مگر میں اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ میں بے بس ہوں مجھے کوئی چارہ نہیں۔ یہ مکافاتِ عمل اور قانون قدرت ہے کہ اس نے

Marfat.com

محرومیوں کا زہراب پی کر مرنا تھا۔کل اس کی مرقد سے اک بوڑھا جنم لے گا۔ایک دنیا دار چاروں چوک سیانا اور جہاندیدہ بوڑھا جسے عشق، احساس، روح محرومی یاس اور داخلیت کے الفاظ محض افسانوی ذہن کی پیداوار معلوم ہوں گے۔

الوداع! اے میری محروم تمنا جوانی الوداع۔ میں آج تجھے اسی طاقت کو سونپتا ہوں۔جس نے تجھے سسک سسک کر بھی زندہ رہنے کی تلقین کی۔الوداع! اے میری جوان حسرتو! الوداع! آسمانوں پر لکھے گئے فیصلوں پر کسی کو کوئی اختیار نہیں۔تمہارا مقدر تمہارے ساتھ مسموم چالیں چلتا رہا۔اس الیے میں کسی کا دوش نہیں۔اگر خواہشیں پروان چڑھ سکتیں تو دنیائے ادب سے آنسو کا لفظ حذف ہو جاتا۔اے تیس سالہ بدنصیب نوجوان! جا تجھے اس داور کے سپرد کیا۔جس نے تیرے چاک دامن کا رفو گر اور تیرے زخموں کا جراح نہ پیدا ہونے دیا۔اگر کل تیری بے قرار روح بھٹکتی ہوئی دوبارہ اس خرابات میں آ نکلے تو اسے زندگی کے نئے قرینے سکھا کر بھیجنا۔

Marfat.com

ادیب اور بیوی

مہنگائی زوروں پر ہے۔ضروریات زندگی نے مرد ذات کے لئے مصروف رہنے کا ایک معقول جواز پیدا کر دیا ہے۔اور اسی معقول جواز کی بدولت اسے زیادہ وقت گھر سے باہر گذارنے کا موقع مل گیا ہے اور اُدھر روز افزوں کے اونچے داموں نے بے چاری عورت کی قوت خرید کو نا قابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے اس کے بازار کے پھیروں پر پھیرے ختم ہو گئے۔معاشرتی ظلم یہ ہوا کہ مرد ''مصروف'' ہو گیا اور عورت فارغ اور سبب ان دونوں کیفیتوں کا ایک ہی ٹھہرا یعنی مہنگائی۔جب آدمی فارغ ہو جائے تو دماغ میں شیطانی چرخوں کے پیچ پڑنے لگ جاتے ہیں۔عورت کا دماغ پھر ویسے بھی ان پیچوں کے لئے زرخیز زمین فراہم کرتا ہے پہلے تو وہ خود بھی خرید و فروخت میں کافی مصروف تھی۔اس لئے خاوند کی مصروفیات کا زیادہ احساس نہیں ہوتا تھا۔وقت ستم ظریف ہے۔مرد کی مصروفیات بڑھ گئیں اور عورت کی مصروفیات گھٹ گئیں ہیں۔

مصروفیات گھٹیں تو الٹے سیدھے دماغ میں چرخے چلنے لگے۔اور مرد کی ہر مصروفیت ''غیر نصابی مصروفیت'' محسوس ہونے لگی۔اوپر سے یہ اخبار والے ظلم کرتے ہیں۔دن دیہاڑے ڈاکوؤں کی خبریں جلی حروف میں چھاپتے رہتے ہیں۔راہ چلتے جب ہاتھ کی چھن رہی ہو تو گھر بیٹھی بیوی (جس کا شوہر فکر معاش میں گھر سے باہر مصروف ہو) کیسے کیسے ہول نہ کھاتی ہوگی۔اس کی یہ ''متاع عزیز'' بھی تو کسی دن دیہاڑے ڈاکوؤں کا شکار ہو سکتی ہے۔نہ جانے کس گھڑی اور کس موڑ پر کوئی ''بیرن'' یہ ''دولت'' لوٹ لے۔ اور اس نصیبوں پھوٹی گھر بیٹھی کی دنیا اندھیر کر ڈالے۔ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ یہ وہ

Marfat.com

دولت نہیں جس کے لٹ جانے کا پتہ پہلے ہی دن چل جائے۔ پہلے بے چارے مرد کی ''مصروفیات'' مختلف حیلوں بہانوں سے لمبی ہوتی ہیں۔ پھر اس کی چال ڈھال وضع قطع میں فرق آتا ہے۔ اور آخری سٹیج میں وہ گھر کو تھانہ سمجھنے لگتا ہے۔ پھر جا کے بیوی کو یقین آتا ہے کہ اس کی گٹھڑی میں چور لگ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج گھر گرہستین عورت کی دعاؤں بھرا سلسلۂ عبادت اس وقت شروع ہوتا ہے جب خاوند گھر سے باہر قدم رکھے۔ اور سکون کا سانس شکرانے کے ساتھ اس وقت آتا ہے جب وہ بخیر وخوبی سالم ثبوت گھر کو پہنچتا ہے۔ میرے ذہن میں تو یہ تجویز بھی ہے کہ جہاں ہم نے عورت کے لئے چادر اور چار دیواری کے عنوان سے تحفظ کا ایک مقدس تصور قائم کیا ہے۔ وہاں مردوں کے لئے بھی ایسا سلسلہ یا فلسفہ ایجاد کرنا چاہئے۔ مفلر، ٹوپی یا پگڑی جیسی چیزوں سے اس تصور کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔

شاعر اور ادیب بڑی حساس مخلوق ہے۔ یہ طبقہ عام شہری مرد کے مقابلے میں ''لوٹ مار'' کا آسانی سے شکار بن سکتا ہے۔ بلکہ زیادہ قرین حقیقت تو یہ ہے کہ ادیب ایک شریف مرد ہوتا ہے جو لٹنے لٹانے کے لئے ہر وقت تیار ملتا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہوتی ہے کہ کوئی لوٹنے والا ملے۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں

یوں تو بے چارے ادیب کے دماغ پر عورت سوار رہتی ہے۔ یعنی اپنی عورت کیونکہ ادیب قسم کا کوئی مرد عورت کے لئے بڑی بے اعتبار ہی شے ہوتا ہے۔ اس کی غزلیں اس کے افسانے اور بعض خطوط بیوی کے ذہن میں ایک مسلسل کھلبلی پیدا کرتے ہیں اور وہ یوں سمجھتی رہتی ہے کہ گویا اس کی متاع عزیز ابھی لٹی کہ ابھی لٹی۔ پھر بھلا ہو اس نظام تعلیم کا کہ آٹھویں جماعت ہی میں لڑکی کو میر تقی میر کے شعر مہک مہک کر پڑھا دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ شعر ہی لے لیجئے۔

Marfat.com

ناز کی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے،
میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

اگر بیوی غزل تک نہیں پہنچی اور دلہن بن کر حضرت ادیب کے گھر بس گئی تو سمجھئے کہ خیر گذشت۔ نہ تو بیوی خاوند کے ''مشکوک اشعار'' سے کانٹوں پر لوٹنے کے عذاب سے دو چار ہوگی۔ اور نہ ہی محترم ادیب کو گھر سے باہر رہنے کے لئے کسی تیر بہدف حیلہ سازی کی ضرورت پڑے گی۔ لیکن جب بیوی نے یہ پڑھ رکھا ہو کہ غزل کے معنی ہیں۔ ''باز نان گفتن'' تو ادیب خاوند کے ہاتھ کی لکھی ہوئی سودا سلف کی فہرست میں سے بھی پوشیدہ مطالب بآسانی تلاش کر لیتی ہے۔ بیویوں کے اس تشکیک اور ادیب حضرات کے عمومی رویئے کے حوالے سے ہم بیویوں اور خاوندوں کو مختلف اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ عورتوں کی پہلی قسم وہ ٹھہری جو ''باز نان گفتن'' کے معنی بھی سمجھتی ہیں اور گھر میں مارشل لاء ریگولیشن جاری کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ایسی بیویاں خاوند کو ویزا لگا کر باہر بھیجتی ہیں۔ اور اگر ویزے کی مدت ختم ہونے کے بعد خاوند گھر میں داخل ہوتا ہے تو ہزاروں قسم کی تاویلات اور وضاحتوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ بہرحال افسانہ نگار اور کہانی نویس اپنے بچاؤ کی کوئی نہ کوئی کہانی گھڑ لیتا ہے۔ اب دیکھئے نا میرے دوست ناصر علی سید ایک دن ریڈیو سٹیشن رک گئے۔ شریف آدمی کو اڑھائی بج گئے۔ ویزا دو بجے دوپہر تک کا تھا۔ اور اسے کالج سے سیدھا گھر پہنچنا تھا۔ خدا جانے اس دن بے چارے نے کیسا دردناک افسانہ جا کر بھابی کو سنایا ہوگا۔ اور کیسے کیسے دل ہلا دینے والے مناظر باندھے ہوں گے۔ اس پہلی قسم کی بیویوں کے خاوند عام طور پر گھبرائے گھبرائے پریشان پریشان اور مدقوق مدقوق سے ہوتے ہیں۔ بہرحال اس ذہنی دباؤ میں بیویوں کی جواب

Marfat.com

طلبیوں کے جواب گھڑ گھڑ کے وہ زود نویس اور بہتر ادیب یقیناً ہو جاتے ہیں۔ دوسری قسم بیویوں کی وہ ہوتی ہے جو غزل کے تھوڑے بہت مفاہیم تو سمجھتی ہیں مگر ویزا جاری کرنے یا خاوند پر قدغنیں عائد کرنے کی صلاحیت سے عاری ہوتے ہیں۔ اور اس بے چاری کو عاری رکھنے کا سہرا بھی مرد کے سر ہوتا ہے۔ اداکار قسم کے ادیب لسان قسم کے لکھاری اور چند مخصوص محکموں میں کام کرنے والے اپنی بیویوں کو بے وقوف بنانے میں دیگر شعبہ ہائے زندگی سے متعلق ادیبوں کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ مثلاً میرے مقابلے میں مشتاق شباب اپنی بیگم کو زیادہ کامیابی کے ساتھ اپنی مصروفیت کا جواز پیش کر سکتا ہے۔ ''ریکارڈنگ، ڈبنگ، ایڈیٹنگ بڑی توجہ چاہتا ہے۔ پروڈیوسٹر کے ذمے بڑا ہی لطیف کام ہوتا ہے۔ پیشہ ایسا ہے جو انہماق اور توجہ مانگتا ہے۔ اور دیر سویر ہو جاتی ہے۔ اور ویسے بھی پی آر والا محکمہ ہے۔ ہر شعبے اور ہر جنس سے ملنا پیشے کی ایک اہم ضرورت ہے۔'' ادھر ہم ہیں کہ مردان سے پشاور تک جانا ہو تو واپسی کا وقت نوٹ کرا کے نکلتے ہیں اور جوں ہی گھڑی کی سوئی مقررہ وقت سے آگے کھسکتی ہے تو نیک بخت کے کان دروازے کی آہٹ پر لگ جاتے ہیں۔ فرحت عباس اور مسرت ہاشمی میرے دوست ہیں مگر ازدواجی بگاڑ کے خوف سے آج تک اپنی نیک بخت کے سامنے ان کا نام لب پر لانے سے گھبراتا ہوں۔ گھریلو بیوی تو اپنے میاں کی ناک پر مکھی بیٹھنا برداشت نہیں کرتی۔ یہ ''مشکوک'' سے نام بھلا کیسے برداشت ہوں گے۔ بعض بیویاں خاوندوں کو تھوڑی تھوڑی ڈھیل دیتی رہتی ہیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ قانونی شکنجوں کو اتنا کس لیتی ہیں کہ بے چارے خاوند آسانی سے سانس بھی نہیں لے سکتے۔ اپنا یار امجد اسلام امجد بھی کچھ ایسے ہی گرفتار ہوا ہے۔ شروع میں دوسروں کی جواب طلبیوں پر جی ہی جی خوش ہوا کرتا تھا۔ جب سے ڈرامہ نویس بنا ہے بھابی نے کافی جامعہ قسم کے ''اسٹینڈنگ آرڈرز'' لاگو کر دیئے ہیں اب تو یہ حال ہے جب بھی امجد اسلام امجد کو فون کیا جائے تو مسز امجد پہلے پورا

Marfat.com

سجرۂ نسب پوچھتی ہیں۔اور پھر اگر تسلی ہو جائے تو امجد سے بات کرنا ممکن ہو سکتی ہے۔ ورنہ وہ گھر پر نہیں ملتے۔بلکہ شہر سے باہر ہوتے ہیں۔

وہ خوش قسمت ہیں کہ جن کی بیویاں بھی پڑھنے لکھنے سے تعلق رکھتی ہیں نہ چوری چکاری کا خطرہ نہ رہزن کا کھٹکا۔نہ دن دیہاڑے ڈاکے کا خطرہ کتنے سکون سے گذر رہی ہوگی۔ادب کے نظریات پر کہیں باہر گفتگو کا موقع نہ ملتا ہوگا۔تو میاں بیوی آپس میں بحث کر لیتے ہوں گے۔منصور قیصر کے بارے میں تو میں اتنا جانتا ہوں کہ اگر کہکشاں بھابی اس سے اتفاق نہ کرے تو وہ باقاعدہ نظریاتی مخاصمت کا ماحول پیدا کر کے آنکھیں نکال لیتا ہے لالہ پچھلے دنوں آنکھوں کی تکلیف کی وجہ سے باہر نہ نکل سکتا تھا۔تو گھر میں برتن کھڑکھتے رہتے تھے۔تاج سعید زیتون بانو، اشفاق احمد بانو قدسیہ، منصور قیصر، کہکشاں ملک اور اسی طرح کے دوسرے دانشور جوڑے کتنے خوش قسمت ہیں۔میاں بیوی دونوں ایک دوسری کی مصروفیات سے واقف ہوتے ہیں۔نہ حیلہ سازی نہ وضاحتیں اور جواب طلبیاں۔ایک دوسرے سے تخلیقی کاموں میں بھی مدد لیتے ہوں گے۔کسی نشست میں کچھ پڑھنا ہے۔اور صاحب نہیں لکھ پائے تو کیا حرج ہے اگر بیوی سے ایک افسانہ لے کر میاں نے اس محفل میں پڑھ دیا تو، ویسے محسوس ہوتا ہے کہ اُدھار مانگنے کی عادت میاں ہی کو ہوتی ہوگی۔ہمیں اگر معلوم ہو جائے کہ بیوی کے پاس چند روپے پڑے ہیں تو ''تلی'' میں کھجلی شروع ہو جاتی ہے۔اور اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک کسی نہ کسی سنجیدہ صورتِ حال کا بہانہ کر کے یہ پیسے جیب میں نہ ڈال لیں ادیب بھلا کیسے چپکا بیٹھتا ہوگا۔جب اُسے معلوم ہو جائے کہ اس کی نیک بخت کسی ادبی تخلیقی کرب سے گذر رہی ہے اور کوئی نیا فن پارہ وجود پا گیا ہے تو یقیناً اپنی ادبی مفلسی اور مندے کا حال بیان کر کے تخلیق بٹور لیتا ہوگا۔یا پھر باہمی مشاورت کے بہانے تخلیق پارہ سن کر اس میں سے کوئی آئیڈیا چرا لیتا ہوگا۔میاں بیوی ایک گھر میں رہتے ہیں۔تو لامحالہ ایک دوسرے پر اثر

Marfat.com

انداز بھی ہوتے ہیں۔ اورانسانی نفسیات کا یہی پہلو دونوں کے لئے صلاح مشورے سے تخلیق کرنے کا سبب بھی بنتا ہے۔

بات یہاں ختم ہوتی ہے کہ اس سارے ہنگامے اور تگ و دو میں سب سے زیادہ فائدے میں وہ ادیب رہتا ہے۔ جو کسی اعلیٰ تعلیمی ادارے میں پڑھاتا ہے۔ ملک میں یونیورسٹیوں کا جال بچھ گیا ہے۔ آج یہاں سیمینار تو کل وہاں۔ ادیب کو دعوت نامہ مل جاتا ہے۔ اور بے چاری بیوی کی تشفی کے لئے مطبوعہ دعوت نامہ کافی نہیں کیا؟ یہ سیمینار ادیب کو کس قدر ازدواجی تحفظ مہیا کرتے ہیں۔ میں نے بڑے بڑے شریف ادیبوں کو ان عالمیانہ تقریبات میں شرکت کی غرض سے ہفتوں گھر سے باہر رہتے دیکھا ہے۔ بیوی نیک بخت بھی خوش ہے کہ اس کے شوہر کا علمی گراف اوپر جا رہا ہے۔ اور خاوند بھی مطمئن کہ گھر سے باہر نکل کر اسے کھلی فضا میں لمبے لمبے سانس لینے کا موقع مل جاتا ہے۔

Marfat.com

سسرال کا تحفہ

پچھلے دِنوں میرے ایک پڑوسی کی شادی ہوئی۔ خوب دھوم دھڑ کا رہا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ آنجناب نہ صرف ایک عدد بیوی کے مالک بنے بلکہ ایک لشکتی پشکتی کار بھی سسرال والوں سے بٹور لائے۔ جو اشیائے ضرورت اندرونِ خانہ آئیں ان کی طرف تو بندہ نے توجہ نہ دی البتہ ان کی چمکتی ہوئی کار دنوں تک میری آنکھوں میں جگ مگ کرتی رہی، اور میں اس وقت کو کوستا رہا۔ جب میری شادی ہوئی تھی۔ ان دِنوں لڑکی کو دینے دلانے کی کوئی رسم موجود نہ تھی۔ اور اگر یہ رسم تھی بھی تو سچی بات یہ ہے کہ اپنے سسرال والوں نے مجھے گدھا تک نہ دیا، کہ اگر ہمارے علاقے میں پانی کی کمی ہو جائے تو کسی قریبی نہر یا جوہڑ سے پانی ہی ڈھویا جا سکے۔ محض دعاؤں اور بلاؤں کی لمبی چوڑی قطار کے ساتھ ہمیں چُوری کے کٹورے کے ساتھ ٹرخا دیا گیا۔ ہاں تو بات پڑوسی کی شادی کی ہو رہی تھی۔ جب شادی کو چار پانچ دِن گذر گئے۔ اور شادی کا شور وشغف کچھ دھیما پڑا تو ایک دِن موقع پا کر جب ہماری ''گورنمنٹ'' کا موڈ قدرے خوشگوار تھا، ہم نے بات چھیڑ دی۔ ''کیا ہی اچھا ہوتا اگر ہمارے سسر حضور کبھی کسی موقع پر ہمیں کوئی تحفہ دے دیتے۔ آخر ان کی سب سے بڑی لڑکی کا سرتاج ہونے کے ناطے کچھ ہمارے بھی اُن پر حقوق بنتے ہیں......بس دِل میں ایک خواہش سی ہے کہ اے کاش ہماری مراد بر آئے۔'' ہم نے ابھی اپنے خطاب کا آغاز کیا تھا کہ تمہید سنتے ہی آنجنابہ پھٹ پڑیں۔ چھاجوں رو رہی ہیں اور ساتھ کے ساتھ گرامر کی پیچ پیچ کا خیال کیئے بغیر بولے چلے جا رہی ہیں۔ پندرہ بیس منٹ کی سوز آمیز تقریر پر تاثیر کا مفہوم کچھ ایسے بنتا تھا کہ ہم ازل سے ناشکرے ہیں اور یہ

Marfat.com

کہ جس دِن محترمہ ہمارے گھر تشریف لائیں تو در و دیوار سے مفلسی و بھوک جھانکتی تھی۔ اس گھر کو راج بھاگ کر کے حضرۃ نے ہی جنتِ نظیر بنایا اور اس وقت ہم سسرال کا دیا کھا رہے ہیں۔ چونکہ آہ و زاری اور تقریر کندھے سے کندھا ملا کر چل رہی تھیں، اس لئے بعض فقروں کے مفاہیم ہماری سوچ سے بھی باہر رہے۔ بہر حال چونکہ ایک پڑھے لکھے شوہر ہونے کی حیثیت سے ہم نے اپنی شادی سے قبل ہی علم عمرانیات کا مطالعہ کر لیا تھا۔ اس لئے اپنی رفیقۂ حیات کی کوئی بھی بات ہمیں بری نہیں لگی۔ وجہ یہ ہے کہ عمرانیات کے سکہ بند مفکرین کا خیال ہے۔ کہ مرد عورت کے ہاتھ میں ایک چرخہ ہے، وہ چاہے تو اُسے سیدھا گھمائے اور چاہے تو الٹا چلائے۔ گویا عورت بات منوانے کا ملکہ رکھتی ہے۔ اس لئے ہم نے آج تک جابر ہونے کے حقوق اپنی ''حکومت'' کے نام محفوظ کر رکھے ہیں۔ آخر ہم کون ہوتے ہیں اتنے پایہ کے مفکرین سے اِختلاف کرنے والے۔ بہر حال اُن کی تقریر ختم ہوئی تو تھوڑی دیر بعد ہم نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ انہوں نے جو کچھ فرمایا وہ مصدقہ اور مسلمہ ہے۔ ساتھ ہی ہم نے کہہ دیا کہ ہم اپنی غلطی پر نادم ہیں۔ اور آپ کا دِل دکھا کر ہمیں ساری رات نیند نہیں آئے گی۔ محترمہ ہماری چکنی چپڑی معذرتوں کا جھانسہ کھا کر پسیج گئیں۔ اور ہم سے وعدہ کر لیا کہ اب وہ میکے گئیں تو والدین کو بصد اِصرار کہیں گی کہ وہ ہمارے لئے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور بھیجیں ''گورنمنٹ'' کا یہ وعدہ ہمارے لئے نوید مسرت لایا۔ اور ہم سارا دِن محترمہ سے بس مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے رہے۔ بلکہ ایک دو دفعہ تو ہم نے یہ مخلصانہ پیش کش بھی کر دی کہ اگر وہ ہمیں صرف ترکیب بتا دیں تو ہم آلو مٹر کا سالن بہت اچھا بنا لیں گے۔ شکر ہے کہ ہماری اس پیش کش کی پذیرائی نہ ہوئی۔ اتنا ضرور ہوا کہ سارا دِن پپو، چنور، گڈو، بیلی اور بکی کو نہلانے اور کپڑے بدلوانے میں بڑا خوشگوار گزر گیا۔ دوسرے دِن تحفہ کے حوالے سے رفقیۂ حیات نے میکے جانے کی خواہش ظاہر کر دی۔ ہم تو بس اِسی انتظار میں تھے فوراً بسم اللہ'' کہہ دیا۔ کہاں وہ صورتِ

Marfat.com

حال کہ آٹھ دس دِن بعد محترمہ گھر واپس آجاتی تھیں۔اور کہاں یہ کہ مہینہ بھر کی چھٹی مانگنے پر بھی ہمیں قطعی عذر نہ ہوا۔اب پروگرام یہ ٹھہرا کہ چونکہ ہماری رفیقۂ حیات نے کچھ نہ کچھ تو لانا تھا ہی اس لئے آنے سے پہلے ہمیں ٹیلی گرام دے دیں گی۔تا کہ ہم محترمہ کو بمعہ تحفے کے شان وشوکت سے گھر لے آئیں۔ویسے بھی خاندان میں عزت بن جاتی ہے۔ تیاری کوچ کی شروع ہوئی۔تمام بچوں کے کپڑے بنوائے گئے۔نند، بھاوجوں اور بہن بھائیوں کے لئے تحفے تحائف خریدتے دو ہزار روپے پر پانی پھیر گیا۔مگر ہم یہ چوٹ پی گئے طبیعت پر بوجھ نہ پڑا۔کیونکہ آنے والے تحفے کی چکاچوند سے دِل کا کونا کونا منور تھا۔ ہم نے ہنستے مسکراتے ہوئے اپنی رفیقۂ حیات کو ٹرین پر رخصت کیا۔گاڑی چلی تو ساتھ ساتھ ہم نے چلتے ہوئے اپنی شوہرانہ ذمہ داری کا آخری ترپ کا پتا بھی موقعے کی نزاکت سے جمادیا کہ جب بھی ذرا ہاتھ تنگ ہوتو مزید رقم کے لئے ٹیلگرام یا خط لکھ دینا۔

اِدھر اپنی ذمہ داری کا بوجھ بڑھ گیا۔دوسرے دن دفتر سے فارغ ہوتے ہوئے ہم نے مختلف پٹرول پمپ والوں سے رابطہ کیا۔ایوی ایشن سپر اور ریگولر پٹرول سے لیکر ڈیزل تک کے بھاؤ معلوم کر لئے۔کئی ایک پمپ والوں سے تو ہم نے ماہانہ ادائیگی کی بات بھی کر ڈالی۔کیونکہ وقت بے وقت پیسے پاس نہ ہوں تو گاڑی چلانا ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔ویسے بھی ہر دفعہ ادائیگی کے لئے پرس نکال کر پمپ والے کے سامنے پیسے گننا ہمیں بڑا عجیب سا لگتا ہے۔ہم نے ایک آٹو موبائیل سپیشلسٹ سے پٹرول کی مختلف اقسام اور مشینری کے مختلف حصوں اور پرزوں پر ان کے اثرات کے بارے میں معلومات جمع کر کے اپنا علم اپ ٹو ڈیٹ کر لیا۔اس کام سے فارغ ہوئے تو شہر سے ہاؤس ڈیکوریٹرز والوں کا ایک نمائندہ گھر بلوا بھیجا۔اس سے مشورہ لیا گیا کہ اگر رنگین ٹیلی ویژن لگایا جائے تو گھر کا کونسا حصہ ٹیلی ویژن کے لئے موزوں رہے گا۔اِن اقدامات سے فارغ ہو کر ہم نے اخبار میں اشتہار دِلوادیا کہ ہمارے پاس ایک بلیک اینڈ وائٹ ٹیلی ویژن اچھی حالت میں

Marfat.com

موجود ہے۔ خواہش مند حضرات کے لئے نادر موقع ہے۔ بہت ستا جا رہا ہے۔

دراصل تحفے کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا تھا۔ پٹرول وغیرہ کی قیمتیں اس لئے معلوم کرلیں۔ کہ اگر کار آئے تو مشینری وغیرہ کے بارے میں دقت نہ ہو۔ پٹرول کی قیمتیں وغیرہ اس لئے جاننا ضروری تھا کہ کہیں گھٹیا پٹرول ڈلوا کر ہم مشینری کا ناس نہ مار ڈالیں۔ یورپ اور جاپان میں بننے والی ہر کار کا خرچہ پٹرول یعنی ایم، پی، جی (مائل پر گیلن) ہمیں زبانی یاد ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی یہ شک گزرتا کہ عین ممکن ہے سسرال والے لڑکی کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے رنگین ٹیلی ویژن دے ڈالیں۔ اب اچھے ٹیلی ویژن کو گھر میں رکھنے کے لئے موزوں جگہ کا انتخاب ضروری تھا۔ ہم بذات خود ٹھہرے ازلی گاؤدی۔ چنانچہ جگہ کے انتخاب کے لئے ڈیکوریٹر منگوانا پڑا۔ ڈیکوریٹر کا گھر منگوانا اس لئے بھی ضروری تھا کہ ہمیں نئی کار کی توقع ہرگز نہ تھی۔ کیونکہ نئی کار کے ساتھ نئی دلہن کا آنا ضروری ہوتا ہے اور نئی دلہن ہمارے مقدر میں کہاں؟ اس لئے اوقات اور عمر کو ملحوظ رکھتے ہوئے 69 یا 70 کا ماڈل ہمارے ذہن میں تھا۔ مگر ٹیلی ویژن کے بارے میں یقین تھا کہ نیا ہی ملے گا۔ مختصر صاحبو! جو ہمارے فرائض میں شامل تھا۔ ہم نے کر ڈالا۔ اور تحفہ کو قبول کرنے کے لئے ہم نے گھر کو پوری طرح سے تیار کرلیا۔ ہمارا گیراج تک چونا گیری سے چمک اٹھا۔ اس تحقیق و تجسس میں اور تیاری میں دس بارہ دن گزر گئے پھر انتظار کے مرحلے شروع ہوئے۔ ہم نے ایک ایک کر کے دن گزارنے شروع کئے۔ دن رات ٹیلیگرام کی انتظار لگ گئی۔ اس دوران ہم نے چند دوستوں اور ہمجولیوں کو معنی خیز انداز میں بتا دیا کہ جلد ہی ہم ایک دھماکہ کرنے والے ہیں۔ دفتر میں آنے والے اور گھر میں ڈاک تقسیم کرنے والے ڈاکیے سے ہم روزانہ پوچھتے کہ کوئی ٹیلگرام ہمارے نام کی ہو یا ہمارے نام کی ٹیلی گرام کی بازگشت انہوں نے سنی ہو جواب نفی میں ہوتا۔ تو طبیعت پر مایوسی کی شام تن جاتی۔ آخر خدا خدا کر کے یہ کفر بھی ٹوٹ گیا۔ دفتر میں ہی مجھے ٹیلی گرام

Marfat.com

ملا۔ مضمون تھا ''ہمیں آ کر لے جاؤ'' طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ ٹیلی گرام میں موجود الفاظ میں پوشیدہ معنی پر غور کرتا تو سیروں خون بڑھ جاتا۔ دفتر کے باہر سڑک پر کوئی ٹرک بھی ہارن دیتا تو وہ ہمیں کار کا ہارن سنائی دیتا۔ جیسے جیسے ہم معنی پر غور کرتے جاتے ویسے ویسے سہانے سہانے تصورات دِل و دِماغ کے تنگ ناؤں میں اُچھلنے کودنے لگ جاتے۔ سارا دِن کام میں جی نہ لگا۔ شتابی سے اپنے صاحب کے پاس گئے۔ ان سے چھٹی کی درخواست کی اور ساتھ ہی عرض کر دیا کہ انشاء اللہ واپسی پر کوئی نہ کوئی ''بڑی چیز'' اپنے ساتھ لاؤں گا۔ اُدھر اپنے رفقاء کو بھی کہہ دیا کہ وہ مینو تیار رکھیں۔ واپس آتے ہی دوستوں کو ضیافت دینے کا ارادہ ہے۔ چھٹی ملی تو بھاگم بھاگ گھر پہنچے۔ کچھ کپڑے وغیرہ اٹیچی کیس میں ڈالے بازار سے سوہن حلوے کے آٹھ دس ڈبے خریدے تا کہ سسرال والوں میں تقسیم کیے جا سکیں۔ ہم چاہتے تھے کہ اگر وہ ہمیں تحفہ دیں تو ہماری طرف سے بھی انہیں خلوص ومحبت کی کمی کا احساس نہ ہونے پائے اور اسی حساب سے ہم نے اڑھائی سو روپے کا نسخہ داؤ پر لگا دیا۔ ہم نے صبح چار بجے والی ٹرین پر دیوانہ ہونا تھا اور درمیان میں ایک لمبی اور کالی رات حائل تھی۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ ہمیں رات کو نیند آ جاتی۔ چنانچہ تہیہ کیا کہ یہ رات کاٹنے کے لئے دو ایک فلمیں دیکھ ڈالی جائیں۔ چنانچہ شہر میں مختلف سینماؤں میں خاک چھانتے ہوئے جب ہم رات کو دو بجے گھر پہنچے تو جیرا بلیڈ سے ہوتے ہوئے بالا گجر، وحشی جٹ اور مس ہانگ کانگ کی سٹوریاں اپنے تمامتر زور دار ڈائیلاگوں کے ساتھ ہمارے دماغ میں کلکاڑیاں کرتی پھر رہی تھیں۔ اور جیب سے ایک لال نوٹ پر لگا کر اڑ گیا تھا۔ رات کا باقی حصہ ہم نے بستر پر کروٹیں لیتے ہوئے گذارا۔

کچھ تحفے تحائف ہماری وزارتِ داخلہ اپنے ساتھ لے گئیں تھیں۔ اگر کوئی کسر باقی رہ گئی تھی تو ہم نے حلوے کے پیکٹوں سے پوری کر دی۔ ہماری بڑی پذیرائی ہوئی۔ خاطر تواضع میں کہیں بھی کوئی کمی محسوس نہ ہوئی۔ ہمارے سالے سالیاں گھل مل کر

Marfat.com

نشست و برخاست میں خوب بڑھ چڑھ کر ہمارا ساتھ دیتے رہے۔ ہم دِل ہی دِل میں اس خوشگوار تبدیلی کا سہرا اپنی حکومت کے سر باندھتے رہے کہ ضرور انہوں نے ہمارے لئے حالات کو اور فضا کو سازگار بنایا ہوگا۔ کیونکہ اس دفعہ ہم نے اپنے گذشتہ دوروں سے حالات مختلف پائے۔ اتفاق دیکھئے کہ اہل خانہ اور اہل محلّہ سے ملنے کا ایسا سلسلہ چلا کہ اپنی حکومت سے تبادلہ خیال کرنے کا موقع ہی نہ بن پڑا۔ ایک دفعہ کمرے میں بات کرنے کا موقع ملا تو ہماری خوشدامن صاحبہ کمرے میں تشریف لے آئیں اور موقع ضائع ہو گیا۔ کچھ مروّت اور حجاب اڑے آ رہا تھا۔ ورنہ باتوں باتوں میں کسی سے بھی بات اگلوائی جا سکتی تھی۔ اور کوئی بس نہ چل سکا تو بہلا پھسلا کر اپنے سب سے چھوٹے سالے پانچ سالہ اختر سے ہی پوچھ لیا کہ سنا ہے آپ لوگوں نے کوئی گاڑی خریدی ہے؟ اس بھلے مانس کے جواب سے ڈھارس بندھ گئی۔ کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ ہمارے سسر بس گاڑی خریدنے کے لئے دِن رات ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ برخوردار سے حوصلہ افزا جواب سن کر ہمیں جو تسلی ہوئی تو ہم نے اپنی زوجہ محترمہ سے پوچھنے کی زحمت ہی گوارا نہ کی۔ ویسے بھی سالے سالیوں کے جم غفیر نے آنجنابہ سے تخلیہ میں بات کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ تین چار دِن خاطر مدارت میں ہی گزر گئے۔ ہماری چھٹی بھی کنارے آ لگی۔ ایک دن شام کو سب اکٹھے ہوئے تو میں نے تمہید باندھی کہ اب مجھے بمع اہل و عیال گھر جانے کی اجازت دی جائے۔ اجازت ملی تو ادھر سے ہماری سرکار کی آواز آئی۔ ارشاد ہوا۔ ''پپو کے ابا! میں نے آپ کو اس لئے بلوایا کہ اکیلے آنا میرے بس میں نہیں تھا۔ ابو نے بچوں کے لئے ایک بکری تحفہ میں دی ہے۔ عورت ذات اسے کیسے لئے پھرتی۔''
ہماری دنیا میں زلزلہ آ گیا تصورات کے تمام محل دھڑام سے نیچے آ رہے۔ بنے بنائے منصوبوں پر پانی پھر گیا۔ آسوں کے تاج محل ویران ہو گئے۔ ایک دفعہ پھر پیدل دفتر جانے کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ نظر اٹھا کر اپنی حکومت کی طرف دیکھا۔ مگر وہاں

Marfat.com

سے برسنے والے شعلوں کی تاب نہ لا کر نظریں جھکا لیں۔ ایک بیچارہ پڑھا لکھا، مہذب اور باوفا، سلیقہ شعار خاوند اس کے سوا کر بھی کیا سکتا ہے۔

قہر درویش، برجان درویش

دوسرے دن گاڑی پر ہمارے ساتھ بریک میں ایک بکری بھی گلے میں ٹکٹ لگائے سفر کر رہی تھی۔ پہلے تو محترم گارڈ نے بریک میں بکری رکھنے سے انکار کر دیا کہ ریلوے کے قواعد و ضوابط اجازت نہیں دیتے تھے۔ مگر جب ہم نے بکری کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے دس روپے کا نوٹ اُن کی تلی پر رکھا۔ تو قواعد و ضوابط کی کتابیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ انہوں نے بکری کو بریک میں رکھنے پر رضامندگی ظاہر کر دی اور ساتھ ہی فرمایا ''میں نے بریک میں آج تک جانور نہیں رکھنے دیا، مگر آپ شریف اور بھلے آدمی معلوم ہو رہے ہیں۔ اس لئے اخلاقاً مجبور ہو گیا ہوں ورنہ یہ کام اصولاً میں کرتا نہیں۔'' ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور آ کر اپنے کمپارٹمنٹ میں بیٹھ گئے۔ دِل میں ارمانوں کی شام غریباں بپا تھی کہ ایک اسٹیشن آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ محترم گارڈ صاحب ڈبوں میں جھانکتے پھر رہے ہیں۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی پھٹ پڑے۔ ''اے مسٹر ذرا چل کر اپنی بکری سنبھالیں اس نے پوری بریک میں مینگنیں بھر دی ہیں ہمارے ریلوے رولز کے مطابق اگر کوئی سینئر افسر چیک کر لے تو مجھے سیدھا گھر بھیج دے۔ برائے مہربانی مینگنیں باہر نکال دیجئے اگر زیادہ مینگنیں دینے والی بکری پالنے کا شوق ہے تو اسے اپنے ساتھ سیٹ پر باندھ دیں۔'' مرتا کیا نہ کرتا۔ سسرال والوں نے ایک جھلنے والی پنکھی بھی ساتھ کر دی تھی کیونکہ کڑاکے کی گرمی پڑ رہی تھی۔ ڈرتے ڈرتے سارا ماجرا رفیقۂ حیات کو کہہ سنایا اور پنکھی کو بطور جھاڑو استعمال کرنے کی اجازت طلب کی خوبیٔ قسمت دیکھئے ہمیں یہ اجازت حاصل ہو گئی۔ بھاگم بھاگ بریک میں جا گھسے پنکھی سے مینگنیں باہر نکالنا شروع کر دیں۔ بکری تھی یا کم بخت مینگنوں کا کارخانہ زیادہ غصہ آیا تو ہم نے اس کے آگے سے گھاس اٹھا کر باہر پھینک دی۔ ''نہ رہے گا بانس نہ

Marfat.com

بجے گی بانسری'' بہر حال جب ہم پسینے سے شرابور بریک سے باہر نکلے تو گارڈ نے ریل کو سبز جھنڈی دکھادی ہم اپنے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم سے بکری کی بو آرہی ہو۔ اور ہر شخص ناک پر رومال رکھے بیٹھا ہو۔ جب پسینہ خشک ہوا اور قدرے اوسان بحال ہوئے۔ تو ہم نے دھیمے دھیمے سے گنگنانا شروع کر دیا۔

بھری دنیا میں آخر دِل کو سمجھانے کہاں جائیں

اپنے ریلوے اسٹیشن پر اترتے ہی ہم سے ہمارے تحفے نے بڑا جارحانہ سلوک کیا پلیٹ فارم پر اترتے ہی بکری نے رسی تڑوا کر آزاد فضاؤں میں کلیلیں بھرنا شروع کر دیں۔ پلیٹ فارم کے اس کونے سے اس کونے تک آگے آگے بکری پیچھے پیچھے ہم، دوڑو پکڑو کے شور میں چند شرفاء نے خرابی بسیار کے بعد بکری پکڑ کر ہمارے حوالے کی اور ساتھ ہی نصیحت فرمائی کہ میاں اگر بکری پکڑنے کا طریقہ نہیں آتا تو ایسا جانور نہ پالو۔ ہمارا ارادہ تھا کہ اس بکری کی قسم، خصوصیت اور اہمیت پر تفصیل سے روشنی ڈالیں مگر اُن شرفاء کے پاس وقت کم تھا اور اپنی تقریر ٹھولائی۔

دوستو! اگر آپ میرے گھر تشریف لائیں تو آپ کو ایک کالی چیز لمبے لمبے کان ہلاتی نظر آئے گی۔ یہی وہ تحفہ ہے جسے میری زوجہ محترمہ میکے سے لائیں۔ روزانہ 4 روپے کا گھاس کھاتی ہے اور ساڑھے تین چھٹانک ایک وقت میں دودھ دیتی ہے۔ البتہ اس سے مینگنیں سیروں کے حساب سے وصول کی جاتی ہیں۔ اور اگر اس کھاد کو فروخت کرنے کا حوصلہ ہو تو منافع حاصل ہو سکتا ہے۔ ہماری رفیقۂ حیات بڑے اہتمام سے اس کا دودھ دوہتی ہیں۔ اور ساتھ ہی تحسین طلب نگاہوں سے ہمیں بھی دیکھتی رہتی ہیں۔ ہم نے بھی مستقبل کے اُن ایام پر نظر رکھی ہوئی ہے جب اس کے بچوں کا ایک ریوڑ بن جائے گا اور ہم دوستوں سے کہہ سکیں گے کہ ہمارا ایک ''گوٹ فارم'' ہے۔

Marfat.com

مستنصر حسین تارڑ سے خیالی مکالمہ

پیارے تارڑ!

السلام علیکم!

تم نے اپنے آخری چند سفرناموں میں اپنے اہل و عیال کا تعارف اس قدر تفصیل سے کرایا ہے کہ بھابی صاحبہ سے لے کر عینی بیٹی تک اک اک بچے کی مفصل خیریت پوچھنے کو جی چاہتا ہے۔ خدا ان سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ میں نے پنجاب یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد تمہارے سفرنامے پڑھانا شروع کیے۔ یہ 65ء۔66ء۔ 67ء کا زمانہ تھا۔ کلاسیکل ادب میں پڑھ چکا تھا۔ لہٰذا ذہنی طور پر تو میں بالغ ہو چکا تھا۔ مگر میری جسمانی بلوغت تمہارے سفرناموں کے اُن حصوں کی دین ہے جن میں تمہاری جولانیٔ طبع اور روانی قلم اپنے عروج پر تھی۔ ایک میں ہی کیا، میرے جیسے کئی اسیرانِ معاشرت ایسے ہی ''ٹوٹوں'' کے طفیل بلوغت کو پہنچے وہ تمہارے عروج کا زمانہ تھا۔ کیا کیا معرکۃ الآرا سفرنامے تمہارے قلم سے نکلے۔ تم سے پہلے بھی کچھ لوگ سفر نگاری کر رہے تھے۔ لیکن وہ سفرنامے نہیں ایک طرح کی خود کلامیاں تھیں۔ لیکن تم نے تو Fingering of mind کا ایک نیا جادو جگا دیا۔ اپنے قاری کی انگلی جو پکڑی تو کتاب کی آخری سطر پر جا کر چھوڑی۔ دنیا تو تم نے دیکھی لیکن اپنے ہزاروں قاریوں کو جیتے جاگتے خواب دکھا ڈالے۔ تمہارا سفرنامہ پڑھتے ہوئے میں تمہاری جگہ ہیرو بن جاتا تھا اور جب خواب ٹوٹتا تھا تو وہ ساری دنیا میرے سامنے ایک نقشے کی طرح پھیلی ہوتی تھی جو تم اپنی کتاب میں بیان کرتے تھے۔ یار تارڑ! تم سفرنامے کی ادبی دنیا میں Trend

Marfat.com

Setter شخص ہو۔ شائد اسے اُردو میں رجحان ساز کہتے ہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں ''کوہستان'' میں کام کرتا تھا۔ اخبار آخری سانسیں لے رہا تھا۔ تنخواہ نہیں تھی اور کام بھی نہیں تھا۔ بس تم تھے، میں تھا اور جہاں گردی تھی۔ جب تم کسی ماہ لقا کا پیکر بیان کرتے تھے تو میرے کانوں کی لوئیں جاگ اُٹھتی تھیں۔ میری کیفیت دیکھ کر کتاب کی چھینا جھپٹی شروع ہو جاتی۔ نتیجتاً مجھ سے زیادہ میرے دوسرے رفقاء نے تمہارے کتابیں پڑھیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے سفر نگاری کا جو بیساختہ اسلوب اپنایا تھا۔ اُس میں تمہاری شعوری کوشش کی بجائے فطرت کی ودیعت کردہ صلاحیت کا زیادہ دخل تھا۔ اُردو ادب میں آج تک کسی ادیب کے اتنے حاسد پیدا نہ ہو سکے جتنے تم نے اپنے خوبصورت بیانیہ انداز سے بنا ڈالے۔ تمہاری دیکھا دیکھی سفر نامہ نگار برساتی مینڈکوں کی طرح نکل آئے۔ ہزاروں لوگوں نے تمہارے انداز میں لکھنے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ جس نے کسی ملک کی اٹلس کو ذرا غور سے پڑھ لیا، وہ سفر نامہ نگار بن گیا۔ ہر ٹام، ڈِک اینڈ ہیری کان پر قلم اڑوسے مولوی منکہ بنا پھرتا تھا۔ مگر کہاں وہ معلوی مدن کی سی بات، ایک دو منکوں کو میں تے پڑھنے کی کوشش کی لیکن بور ہو کر پھر کبھی کسی سفرنامے کو پڑھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ مختار مسعود سدا کا فلسفی آدمی ہے۔ اونچے پلیٹ فارم سے بات کرتا ہے۔ لفظوں سے کھیلتا ہے۔ فارسی تراکیب تخلیق کرتا چلا جاتا ہے۔ مجھے اُس کا ''سفر نصیب'' اچھا لگا۔ جہاز کی پینتالیس منٹ کی اڑان میں وہ پورا عالم گھوم آتا ہے۔ معاشیات کے آدمی کا یہ کمال ہے۔ لیکن اُسے صرف وہی قاری پڑھتا ہے جس کا علمی پس منظر ہو اور جسے زبان کا چٹخارہ پسند ہو۔ تارڑ! تمہیں آج ایک نئی بات بتاؤں؟ بخدا اشفاق احمد نے تمہارے اسلوبِ نگارش کی نقل مارنے کی کوشش کی۔ اپنے علمی و ادبی ڈِکشن اور سنجیدہ مزاجی کے برعکس اُس نے اپنے قلم کو تمہارے رنگ میں ڈبونے کی کوشش کی۔ میں اُس کا ''سفر در سفر'' پڑھتا جاتا تھا اور بے یقینی کے ساگر میں اُترتا جاتا تھا۔ یہ تمہارے لئے کتنے اعزاز کی بات ہے کہ

Marfat.com

اشفاق احمد جیسا ہمہ جہت دانشور تمہاری تقلید میں اک کھلنڈرے سٹائل کا سفر نامہ لکھ ڈالے۔لیکن یار مستنصر ایک بات میں خدا لگتی کہہ رہا ہوں کہ یار لوگوں نے بڑے جتن کیے خوبصورت گٹ اپ اور عمدہ صوتی اور قیمتی کاغذ کے ساتھ سفرنامے چھپوائے لیکن کوئی تمہاری گردِ پا کو نہ پہنچ سکا۔ذوق نے کہا تھا

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت، زور غزل میں مارا

پھر ایسا ہوا کہ تقریباً دو عشروں کی لمبی اور کامیاب ''میرا تھان'' کے بعد تم پر تھکن کے آثار نمود ہونے لگے۔کچھ عمر گریز پا نے بھی اپنا جلوہ دکھانا شروع کر دیا۔چنانچہ مجبور ہو کر تم نے سلجوق سمیر اور عینی اور بھابی صاحبہ کو اپنی مدد کیلئے بلا لیا۔پھر اس طرح کی تحریریں تمہارے ہاں ملنے لگیں ''مصنف اپنی اہلیہ کے ساتھ ہوٹل کے باہر خوشگوار موڈ میں'' یا یہ کہ ''بیٹے سلجوق کے ساتھ ندی عبور کرتے ہوئے،تصویر میں بیٹی عینی بھی ساتھ ہے''۔کچھ ایسا لگا کہ تمہاری سانس پھول گئی ہے اور تمہارا تخلیقی عمل رُک سا گیا ہے۔تمہارے پاس اب مشاہدے اور اظہار کے رشتے کو موتی میں پرونے کیلئے کافی لوازمات کم ہو گئے ہیں۔ اگر چہ فیملی کو مدد کیلئے بلانا تمہاری مجبوری تھی لیکن یار لوگوں نے تمہاری مجبوری میں گھٹنوں سے پھٹی ہوئی پتلون کی کیسی کیسی نقل مار ڈالی۔اخباروں میں باتصویر سفر ناموں کا ایک سیلاب اُمڈ آیا۔تمہارے معاملے میں میں سمجھتا ہوں کہ تبدیلی کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ اولاً اولاد جوان ہو رہی تھی۔بادل نخواست تمہیں اپنے اوپر بڑھاپا طاری کرنا پڑا۔چنانچہ رخشِ خیال و قلم کی باگیں بھی کھینچنا پڑی۔(یہ الگ بات ہے کہ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔تم باز نہ آئے تو ٹیلیویژن پر شادیاں کرانا شروع کر دیں) ثانیاً تم نے سفر نامہ نگاری میں اک نیا تجربہ کرنے کی کوشش کی۔احمد ندیم قاسمی نے آخری سالوں میں شعر کہنا چھوڑ دیا تھا اور کہا کرتے تھے ''جگالی کرنا مجھے پسند نہیں اور اس عمر میں کسی نئے

Marfat.com

شعری تجربے کا میں متحمل نہیں ہوسکتا۔'' پھر درمیانی عرصے میں میں نے تمہیں پڑھنا چھوڑ دیا۔تم نے کوئی ایک آدھا گھمبیر فلسفے والا مذہبی سفرنامہ بھی لکھا۔تم نے بیت اللہ شریف اور روضہء رسول ﷺ پر حاضری دی۔اور پھر اپنے تاثرات کو سفرنامے کی صورت میں پیش کر دیا۔میں بیمار ہو کر چارپائی سے جالگا۔مختلف بیماریوں نے گھیر لیا۔جب جانور ''لِستا'' ہو جاتا ہے تو پرندوں سے لے کر چیونٹی تک ہر چیز اُسے ٹھونگے اور چک مارتی ہے۔تھوڑا عرصہ ہوا ہے کہ طبیعت بحال ہوئی ہے مگر نیم دروں، نیم بروں۔پچھلے دنوں مجھے ایک دوست نے تمہاری ''پتلی پیکنگ کی'' لا کر دی۔مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ''تارڑ رہ گیا۔اُگا ای رہ گیا'' یار میں اک نرگست گزیدہ بوڑھا ہوں۔سر بالکل چٹیل میدان ہے۔آنکھیں تین عینکوں کی محتاج ہیں۔کُب نکل آیا ہے۔چلتا ہوں تو گلی میں لہریا بنا کر چلتا ہوں، کبھی اس کنارے تو کبھی اُس کنارے تو ندمجھ سے میل بھر آگے چل رہی ہوتی ہے۔لیکن جب کسی پُررونق محفل میں بیٹھتا ہوں تو یہ فقرہ دہراتا رہتا ہوں ''بس یار اب بوڑھا ہو گیا ہوں''۔مگر دِل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ اہل محفل میں سے کوئی میری بات کی تردید کرے اور کہے۔''نہ جی اعوان صاحب! آپ نے خود کو بڑا Maintain رکھا ہوا ہے۔آپ اپنی عمر سے پندرہ سال چھوٹے لگتے ہیں''۔کبھی کبھی یہ دِلی مراد پوری بھی ہو جاتی ہے اور میں مہینوں خوش رہتا ہوں۔''پتلی پیکنگ کی'' پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ مجھ سا اک مریض اور بھی ہے جو بار بار اپنے بڑھاپے کی بات کر کے کسی جانب سے اپنی جھوٹی تعریف کا متمنی ہے۔اپنی تریسٹھ سالہ نرگسیت اچھی لگی۔

یار! یہ کیا تم اک تتلی کو درمیان میں لے آئے ہو۔میرے ان پڑھ دماغ نے اسے قبول نہیں کیا۔علامت اور تجرید نے پہلے ہی ہماری شاعری اور افسانے کا بینڈ بجا دیا ہے۔تم اچھے خاصے ''سیانڑیں بیانڑیں'' ہو کر کس راہ پر چل نکلے ہو۔پھر اک جگہ تو ڈاکٹر سن بات سن کو تم نے کمپولسٹ پارٹی کا لیڈر لکھ کر اپنے بوڑھے ہو جانے کی دلیل دے دی۔

Marfat.com

حالانکہ سن یات قوم پرست تھا۔کمیونسٹ پارٹی تو اُس کے مرنے کے بعد 1925ء میں معرضِ وجود میں آئی۔(صفحہ 287)

تارڑ بھائی! میں کچھ زیادہ بول گیا ہوں۔دراصل اک طویل عرصے سے میری یہ آرزو تھی کہ تم سے چہرہ بہ چہرہ یعنی بالمشافہ ملوں اور ڈھیر ساری باتیں کروں کیونکہ تم نے اس زندگی کو گنگناتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے عبور کیا ہے۔جانے تم نے یہ سفر کیسے اتنی آسانی سے طے کرلیا؟ یہ تمنا اک مدت سے سینے میں سُلگ رہی تھی کہ تم سے ملاقات ہو پائے۔اک دفعہ کوئٹہ میں قلم قبیلہ کے کٹھ میں تم سے ملنے کا چانس نکل رہا تھا۔لیکن تم اس طرح سے پروانوں میں گھرے ہوئے تھے کہ حجرِ اسود کی طرح کوشش کے باوجود تم تک نہ پہنچ سکا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

میرے خیال میں یہ اتنی ساری باتیں اُسی ناکامی کا نفسیاتی ردِعمل ہوسکتا ہے۔

میں نے تم سے بات کرنے کیلئے صیغہ ہائے تخاطب کی کسی تہذیب کوملحوظِ خاطر نہیں رکھا۔ مجھے معاف کردینا۔دراصل میں خدا سے بھی تم،تو اور تیرے کے صیغوں کے ساتھ مخاطب ہوتا ہوں۔سب یہی کرتے ہیں۔تم بھی تو ادبی دنیا کے دیو پیکر خدا ہو۔

بس اک آخری خواہش کا اظہار۔قبر کنارے بیٹھا ہوں۔نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے۔میں نے اپنے کمرے میں ایک بڑا میز رکھ کر تقریباً ایک سو کتابوں کی لائبریری بنانے کا ارادہ کیا۔ایسے مصنف اکٹھے کروں گا جن کی تحریریں مجھے جوانی سے آج تک ہانٹ کرتی رہی ہیں۔متاثر کرتی رہی ہیں۔میں پڑھتا رہا ہوں اور ہر دفعہ اک نئی لذت سے آشنا ہوتا رہا ہوں۔اس لائبریری کا آغاز تم سے دستِ سوال دراز کر کے کر رہا ہوں۔اپنی چھ سات نمائندہ کتابیں (سفرنامے) اپنے دستخط کے ساتھ مجھے پارسل کردو۔میں قیمت ادا نہیں کرسکتا۔سارا خرچہ اپنی جیب سے کرو۔اگر کسی وجہ سے

Marfat.com

بندہ پروری کی تمہیں یہ توفیق حاصل نہ ہو تو مروتاً معذرت خواہی ضرور کر لینا میں تمہارے معذرت نامے کو بھی اعزاز سمجھوں گا۔ اختتامیہ کلمات یہ ہیں کہ میں اک ان پڑھ اور جاہلِ مطلق شخص ہوں۔ میری اُردو اتنی اچھی نہیں ہے۔ کئی جگہ پر تراکیب و مصادر اور لفظ و معنی باہم دست و گریباں بھی ملیں گے۔ میری غُربت عملی اور عسکریت نوردی کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے نظر انداز کر دینا۔ میری کوئی بات خلافِ واقعہ ہو یا نا گوار لگی ہو تو درگذر کر دینا۔

تمہارا قدیمی چاہنے والا

Marfat.com

یادوں کے گلاب (۱)

پیارے قاری! میرا تعلق اک مذہبی گھرانے سے ہے۔ میرے خاندان کے لوگ دیوبندی مکتب فکر کے پیروکار ہیں۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند، کاروباری لوگ جو کوچۂ سیاست سے کوسوں دور ہو کر گذرتے ہیں۔ لیکن میں باغی ہو گیا، کیونکہ میں مولانا مودودیؒ کے افکار سے متاثر تھا۔ پہلے ہی گھر والے میرے بارے میں متفکر رہے تھے اور پھر ''خلافت وملوکیت'' کے آنے کے بعد اُن کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ 65ء کی جنگِ ستمبر کی بازگشت ابھی تک فضاؤں میں موجود تھی۔ معاہدۂ تاشقند کے راز ہائے سربستہ کی بلی تھیلے میں داخل ہو چکی تھی۔ آہستہ آہستہ ایوب خاں کے خلاف اک مہین سی فضاء بننا شروع ہو گئی تھی۔ کہیں کہیں اک آدھے شہر میں منچلے طالب علموں کی ٹکڑیاں اک آدھ گھنٹے کے لئے کلاسوں کا بائیکاٹ کرتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اُس وقت کا طالب علم بچہ تھا اور اُسے بچہ سمجھ کر ہی حکومت برتاؤ کرتی تھی۔ دوپہر کو ''ہڑتالی'' طالب علموں کو گرفتار کیا جاتا اور شام کو ٹھوکر نیاز بیگ کے ویرانوں میں چھوڑ دیا جاتا۔ (اُس وقت ٹھوکر _ بیگ میں کھیت ہوتے تھے اور ویرانہ ہوتا تھا) یا پھر محمود بوٹی بند کے اُس پار بیلے میں چھوڑ دیا جاتا۔ میرے بزرگ میری سیاسی شرارتوں اور آئے دن کی قید و بند سے تنگ تھے۔ چنانچہ سیانے سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور فیصلہ یہ ہوا کہ مجھے کسی مضافاتی تعلیمی ادارے میں داخل کرا دیا جائے جہاں ''نہ کوئی آوے نہ کوئی جاوے تے نہ کوئی پھیرا پاوے'' قرعہ فال گورنمنٹ کالج رحیم یار خان کے نام پڑا جہاں بڑے بھائی کے اک دوست پرنسپل تھے۔ آج سے چالیس بیالیس سال پہلے رحیم یار خان ضلع ہونے کے باوجود ایک سویا سویا سا دیہاتی شہر تھا۔ کھلی

Marfat.com

کھلی سی سڑکیں۔ شہر کے آخری کنارے پر کھیتوں میں ایستادہ ڈگری کالج، جہاں تازہ تازہ بی اے کی کلاسیں شروع ہوئی تھیں۔ شہر کی آبادی بھی کم تھی اور شہر زیادہ تر تاریخی گلی کوچوں میں سمٹا ہوا تھا۔ سادگی یہ تھی کہ کالج میں معدودے چند لڑکے پتلونیں پہننے والے تھے۔ شلوار قمیض کا رواج تھا۔ پتلونیں صرف وہی لڑکے پہنتے تھے جو میری طرح ''مائیگریشن کیس'' تھے۔ اِن باؤ لوگوں کو طلباء کے طعن و تشنیع اور بول بچن کا سامنا رہتا تھا۔ کالج سے ملحق ہوسٹل تھا۔ مگر میرے بزرگوں نے میرے مشکوک سیاسی چال چلن کی وجہ سے مجھے ہوسٹل میں داخل کرنے کا رسک نہ لیا۔ رحیم یار خان سے جنوب یعنی سندھ کی جانب پنجاب کا آخری شہر صادق آباد 24 کلومیٹر پر واقع ہے۔ کراچی سے آنے اور جانے والی ریلیں صادق آباد کو چھو کر گذرتی ہیں۔ اِس شہر میں میرے چچا رہتے تھے۔ میرے یہ سگے اور سب سے چھوٹے چچا جہاں انتہاء کے پرہیز گار اور زاہد تھے، وہاں نظم وضبط کے بارے میں انتہائی سخت گیر تھے۔ گھر میں داخل ہوتے تو ہر فرد کھو کہ سانپ سونگھ گیا ہے۔ بلا کے ہتھ چھٹ اور اعلیٰ درجے کے خبر گیر۔ اُن کی اجازت کے بغیر چڑیا صحن کے اوپر سے نہیں گذر سکتی تھی۔ نو سال کے مذکر بچے کو مسنون پگڑی پہنا دی جاتی اور چار سال کی بچی کو طویل و عریض چادر ڈال کر ڈھانپ دیا جاتا تھا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ہم انہی چچا موصوف کے سایۂ عاطفت میں رہیں گے اور صادق آباد سے روزانہ تحصیل علم کے لئے رحیم یار خان آیا جایا کریں گے اُدھر محترم چچا صاحب کو ایک چٹھی بہ تفصیل ہدایات روانہ کر دی گئی۔ پرنسپل صاحب تو ویسے بھی برادرِ بزرگ کے دوست تھے اور اُنہیں بھی اطلاعی خط لکھ دیا گیا۔ اِن حالات میں اک ''طالب علم رہنما'' صادق آباد پہنچا۔ چچا محترم ریلوے اسٹیشن پر بہ نفسِ نفیس استقبال کے لئے موجود تھے۔ انہوں نے مجھے آہنی ہاتھوں سے وصول کیا۔ تانگے میں بیٹھ کر گھر پہنچنے تک انہوں نے رہن سہن اور معاشرتی ادب آداب کے تمام قواعد وضوابط مجھے ازبر کرا دیئے۔ چونکہ پتلون میری مجبوری تھی لہٰذا یہ رعائت دی

Marfat.com

گئی کہ کالج جانے کیلئے پہنی جاسکتی ہے لیکن پتلون پہن کر گھر داخل ہونے کی منائی تھی۔ حکم ہوا کہ ''کت خانہ'' باہر بیٹھک میں ہی رہے گا۔ گھر کے لئے باحیا لباس کی اجازت ہوگی۔ گویا ہمارا قیام بیٹھک میں ہوگا پگڑی پہننے کے بارے میں یہ چھوٹ دی گئی کہ دو سفید ٹوپیاں گھر میں پہننے کو عطا ہوئیں۔ ان حالات میں اپنی سیاسی کرنیوں کا پھل پاکر ہم گورنمنٹ کالج رحیم یار خان میں بی اے کے فائنل میں ایک ''سپیشل مائیگریشن کمیس'' بن کر داخل ہوئے۔ 66ء کے آخری چند ماہ تھے۔ 67ء سیاسی افراتفری کے ساتھ دستکیں دے رہا تھا۔

تمام چھوٹی بڑی ریل گاڑیاں صادق آباد سے ہو کر گذرتی تھیں۔ بڑی ایکسپریس ٹرینیں تو ''رن تھرو'' ہونے کی وجہ سے مٹی کا طوفان برپا کر کے تیزی سے گذر جاتیں لیکن لوکل یا پسنجر ٹرینیں بہرحال رکتی تھیں۔ صادق آباد سے بڑی تعداد میں طلباء روزانہ رحیم یار خان مختلف تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے جاتے۔ صبح طلباء کا اک جمِ غفیر صادق آباد ریلوے اسٹیشن پر نظر آتا یہی کیفیت چھٹی ہونے کے بعد سہ پہر کو رحیم یار خان کے اسٹیشن پر ہوتی۔ سکھر سے اک پسنجر ٹرین خانپور تک چلتی تھی۔ صبح سات، ساڑھے سات بجے یہ صادق آباد اسٹیشن پہنچتی تھی۔ یہ واحد سواری تھی جو پہلے پہر غریب غربا اور طالب علموں کو میسر تھی۔ اِس ٹرین کا سرکاری نام تو خدا جانے کیا تھا لیکن طلباء نے اس کا نام ''اللہ ڈِوائی'' رکھا ہوا تھا۔ اس نام نے اتنا قبول عام حاصل کیا کہ ریلوے کا عملہ بھی اسے اللہ ڈِوائی (اللہ کی عطا کردہ) کہنا شروع کر دیا۔ اس پسنجر یعنی لوکل ٹرین کے بعد خیبر میل اور چناب ایکسپریس آتی تھیں اور دندناتی ہوئی گذر جاتی تھیں۔ ''اللہ ڈِوائی'' بیچاری کو کہیں راستے میں ہی اکثر ''کھوڈے لائن'' لگا کر ایکسپریس ٹرینیں گذار دی جاتیں۔ اس طرح صادق آباد سے سوار ہونے والے طلباء اللہ ڈِوائی کے لیٹ ہونے کی وجہ سے کالج دیر سے پہنچتے اور جرمانے کے سزاوار ٹھہرتے۔ لیکن تم ڈال ڈال، ہم پات پات'' کے مصداق اس

Marfat.com

مسئلے کا حل بھی ڈھونڈ لیا گیا۔ اُس زمانے میں ریلوے کے الیکٹرک سگنل نہیں ہوتے تھے۔ اسٹیشن پر گاڑی کی آمد کی گھنٹی بجتی تھی۔ کانٹے والا کیبن میں لگے کچھ ہینڈلوں کو زور لگا کر اوپر نیچے کھینچتا تھا اور متعلقہ سمت میں اسٹیشن سے دور لگا سگنل ڈاؤن ہو جاتا تھا۔ یہ آنے والی گاڑی کو اذن ہوتا تھا کہ وہ اسٹیشن پر آسکتی ہے اور اگر میل ٹرین ہے تو بھاگتی دوڑتی اسٹیشن سے گذر سکتی ہے۔ میں کالج میں نیا وارد ہوا تھا لیکن

مجھ سے پہلے اُس گلی میں میرے افسانے گئے

میری ''بدنامیوں'' نے یہاں بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ لاہور سے لوگوں نے پہلے ہی یہاں کے لوگوں کو ہماری نام نہاد ''قائدانہ صلاحیتوں'' کے بارے میں بریف کر دیا تھا۔ یہاں پہ سادمرادے طلباء تھے۔ ہماری پتلون ہماری ''قادرالکلامی'' اُردو انگریزی میں اُلٹا سیدھا پراعتماد لہجہ اور مافی الضمیر کے اظہار پر عبور نے ہمیں اندھوں میں کانا راجہ بنا دیا۔ چنانچہ ہمیں دانشور سمجھتے ہوئے روزانہ کے جرمانوں سے تنگ آئے طلباء نے مسئلے کے حل کے لے ہم سے راہنمائی مانگ لی۔ چنانچہ ایک دن جب تمام طلباء اسٹیشن پر اکٹھے تھے اور گاڑی حسب معمول لیت تھی ہم نے مسئلے کا حل ڈھونڈ نکالا۔ بیرونی سگنل جب اپ رہتا تھا تو نیچے اک خلاء سا سگنل کی سلاخوں اور زمین کے درمیان موجود رہتا تھا۔ لیکن جونہی سگنل ڈاؤن ہوتا تو خلاء پر ہو جاتا ہم نے دماغ لڑایا کہ اگر کسی وجہ سے سگنل ڈاؤن نہ ہو تو ٹرین اسٹیشن سے باہر آ کر رُک جائیگی۔ اور طلباء کو وہیں سگنل کے قریب گاڑی پر سوار ہونے کا موقعہ مل جائے گا۔ ٹرین کی آمد کی گھنٹی سے پہلے ہم چند طلباء کو لے کر آؤٹر سگنل پر پہنچ گئے۔ ایک اینٹ سگنل کے گیپ کے نیچے رکھ دی گئی۔ اب کانٹے والا زور لگا رہا ہے تاکہ چناب ایکسپریس کو گذرنے کا اذن دیا جاسکے مگر اینٹ آڑے آگئی اور ایکسپریس ٹرین اسٹیشن سے باہر رُک گئی۔ تمام طلباء دوڑ کے سوار ہو گئے۔ ایک تنومند لڑکے نے سگنل کے نیچے سے اینٹ ہٹائی اور خود بھی سوار ہو گیا۔ پھر یہ معمول ہو گیا اور

Marfat.com

ہمیں مسلمہ لیڈر تسلیم کرلیا گیا۔ خیبر میل اور چناب ایکسپریس اکثر آؤٹر سگنل کے باہر ہی رُکنے لگیں۔ ٹرین کا عملہ بھی ہمارا دوست بن گیا۔ ہم سگنل کے نیچے اینٹ دے کر گاڑی کو پانچ منٹ روکتے اور عملہ اپنا اوو ٹائم کرنے کے لئے روزنامچے میں آدھا گھنٹہ لکھتا اور اس کی وجہ شرارتی طلباء کا ٹرین کو زبردستی روک لینا لکھی جاتی۔

میں واپس اپنے داخلے کی طرف آتا ہوں۔ چچا صاحب محترم نے اپنے ایمان کو حاضر ناظر جان کر ہماری اصلاح کا بیڑا اُٹھالیا۔ اور ہمیں سونے کا نولہ کھلا کر شیر کی آنکھ سے دیکھنا شروع کر دیا۔ داخلے والے دن وہ خود میرے ساتھ ٹرین پر رحیم یار خان گئے۔ ٹرین پر سوار ہونے والے طلباء کا تیکھی نگاہوں سے جائزہ لیتے رہے۔ وہاں کالج کے پورے ماحول کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ چونکہ پرنسپل مرحوم سید فضل علی شاہ کو بھی خط پہنچ چکا تھا لہٰذا بادی النظر وہ بڑے تپاک سے ملے۔ بڑی خاطر تواضع کی۔ کچھ نصیحتیں کریں اور کچھ دھمکیاں دے کر مجھے متعلقہ کلریکل سٹاف کے حوالے کیا اور چچا جان محترم کے ساتھ اُن کی علیحدہ اعلیٰ سطحی کانفرنس شروع ہوگئی۔ وہ پورا دن چچا جان نے اس طرح سایہ بن کر میرے ساتھ گذارا گویا کہ میری جگہ وہ داخلہ لے رہے ہوں اعلیٰ سطح کانفرنس کے خاطر خواہ نتائج گذرتے وقت کے ساتھ برآمد ہونا شروع ہو گئے۔ نماز حاضری اک مطبوعہ رجسٹر نما کاپی منگوالی گئی۔ ہمارے لئے حکم ہوا کہ ظہر کی نماز کے علاوہ ہم تمام نمازیں محلے کی مسجد میں ادا کریں گے اور ہر نماز کی حاضری کی امام مسجد صاحب اپنے دستخط سے توثیق کریں گے۔ مولانا سے پہلے ہی درخواست کر دی گئی تھی۔ انہوں نے نئے نئے دستخط کرنا سیکھے تھے لہٰذا اُنہیں بڑا اشتیاق رہتا کہ میں کب رجسٹر حاضری اُنہیں پیش کروں اور کب وہ دستخط کی مشقِ قلم فرمائیں وہ ''بقلم خود'' بھی ساتھ لکھنا نہیں بھولتے تھے اور پھر کاپی مجھے واپس کرنے سے پہلے مختلف زاویوں سے اپنے دستخط کے حسن و قبح پر تفصیلی نظر ڈالتے۔ نو عمری کی نیند اور نور کے تڑکے کا عالم لیکن آذان سے پہلے

Marfat.com

ہمیں اس نصیحت کے ساتھ جھنجھوڑ کے اُٹھا دیا جاتا کہ فجر کی نماز پر سب سے پہلے مسجد میں داخل ہونے پر ستر نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔ وہ چھ ماہ کا قیام مجھے سحر خیز بنا گیا۔ ساٹھ سال کی اِس اُدھیڑ عمر میں بھی صبح چار بجے سے پہلے بستر چھوڑ دینے کی عادت نہیں گئی۔ بہر حال چچا محترم کو نمازی آدمی کے ماتھے پر محراب سے بڑی عقیدت تھی۔ میں نالائق اصلی محراب کا سزاوار تو نہ ٹھہر سکا لیکن جب کوئی غرض و غائت اُن کے سامنے پیش کرنی ہوتی تو خدا سے معافی مانگتے ہوئے انتہائی کاریگری کے ساتھ ماتھے پر ہلکا سا محراب بنا دیا جاتا۔ نتیجتاً ساری درخواستیں منظور ہو جاتیں۔ میں جب تک صادق آباد میں رہا، میرے مہربان چچا نے مجھے بڑا پیار دیا۔ انہوں نے واقعی مجھے سونے کا نوالہ کھلایا۔ میری ضرورتوں کا بہت خیال رکھا۔ اپنے بچوں سے زیادہ مجھے فوقیت دی۔ بلکہ مجھے گھر کے خوردو کلاں پر ''گاڈ فادر'' بنایا۔ میں نے بھی اپنی طرف سے پوری کوشش کی کہ وہ مجھے کبھی شیر کی آنکھ سے نہ دیکھیں۔ کوئی دوستیاں نہ پالیں۔ کبھی سینما دیکھنے نہیں گیا اور سب سے بڑی بات کہ اُس پورے عرصے میں اُن سے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور کبھی اُن کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچایا۔ کبھی تذکرہ ہوتا تو وہ عزیز و اقارب کے سامنے میری جوان پارسائی کی قسمیں کھاتے۔

Marfat.com

یادوں کے گلاب (۲)

پیارے قاری! پچھلی نشست میں گورنمنٹ فرید کالج رحیم یار خان میں داخلے کا تذکرہ ہوا تھا۔ اُس کالج سے بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ تصور میں یادوں کا اک کارواں میرے ساتھ ہولیا ہے اور گزرے وقت کا ایک لمحہ ذہن کی سکرین پر فلم کی طرح چلنے لگا ہے۔

کیا کیا ہمیں یاد آیا جب یاد تیری آئی

سید فضل علی شاہ کالج کے پرنسپل تھے۔ مرحوم کا تعلق زمانہ قبل از تقسیم مشرقی پنجاب سے تھا۔ ہجرت کر کے ملتان آباد ہوئے۔ چہلیک چوکی کے نزدیک تین مرلے کا اک مکان اُن کی کل کائنات تھی۔ گھر چوبارے پر تھا اور نیچے دو یا تین دکانیں تھی جو کرائے پر دے رکھی تھی۔ وہ پہلے گورنمنٹ کالج لیہ کے پرنسپل رہے جب کالج شہر سے باہر ایک ویرانے میں منتقل ہو رہا تھا تو جون جولائی کی چلچلاتی دھوپوں میں سر پر سولو ہیٹ پہنے شاہ صاحب عمارت کی ایک ایک اینٹ اپنے سامنے چنواتے ہوئے دیکھے گئے۔ تمام پلے گراؤنڈز کی پیمائشیں انہوں نے فیتا اپنے ہاتھوں میں لے کر کیں۔ درختوں اور پودوں کے لگانے میں اُن کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ شجر کاری کے پورے منصوبے کی ایک کاپی ہر وقت اُن کے ہاتھ میں ہوتی۔ میں جب رحیم یار خان میں داخل ہوا تو یہ فضل علی شاہ کی سروس کے تقریباً آخری ایام تھے۔ جب آنکھ بند کرتا ہوں تو تصور میں اُن کا مہربان چہرہ نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔ سفید براق سر کے بال، سفید سوٹ، بظاہر کرخت لہجہ لیکن دِل بچوں کی محبت سے لبالب۔ انتہا درجے کے منتظم اور ڈسپلن کے پابند، طلباء تو طلباء اساتذہ پر ہر وقت اُن کا خوف طاری رہتا تھا۔ میں نے کالج میں انہیں کبھی اپنے

Marfat.com

آفس میں آرام سے بیٹھے ہوئے نہیں دیکھا۔ اُن کی موجودگی ہر جگہ محسوس کی جاتی تھی۔ سیماب پا تھے۔ ابھی کلاسیں چیک کر رہے ہیں تو اگلے لمحے کنٹین میں پہنچ کر اشیائے خوردونوش کے معیار اور بھاؤ کے بارے میں استفسار کر رہے ہیں۔ کینٹین میں جو صفائی ستھرائی کا معیار اُن کے وقت میں قائم ہوا، وہ نہ پہلے تھا اور نہ بعد میں رہ سکا۔ انہوں نے اساتذہ کیلئے، گاؤن لازم قرار دیا۔ ایک دفعہ ایک انتہائی سینئر پروفیسر کو گاؤن نہ ہونے پر کالج میں داخل ہونے سے منع کر دیا۔ اس واقعے کا میں چشم دیدہ گواہ ہوں۔ چونکہ کالج کی عمارت دو منزلہ تھی اس لئے دو طرف سے سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں۔ انہوں نے ایک سیڑھی اساتذہ کیلئے اور دوسری سیڑھی طلباء کے آنے جانے کے لئے مخصوص کر کے وہاں بورڈ لگا دیئے۔ پھر کبھی کسی طالب علم نے دوسری سیڑھی استعمال کرنے کی جرأت نہ کی اور یہی رویہ اساتذہ کا تھا کہ وہ صرف اساتذہ کے لئے مخصوص سیڑھی ہی استعمال کرتے رہے۔ مجھے ایک واقعہ کبھی نہیں بھولتا۔ ایوب خان کے خلاف تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ طلباء پہلی دفعہ سڑکوں پر آئے تھے۔ گورنمنٹ کالج رحیم یار خان کے طلباء نے بھی کلاسوں کا بائیکاٹ کر کے جلوس نکالنے کا پروگرام بنایا۔ کالج سے اگر گورنمنٹ ہسپتال (اب ابوظہبی ہسپتال) کی طرف جائیں تو ایک چوراہا بنتا ہے۔ ایک روڈ کالج کی طرف، دوسری ہسپتال اور آمنے سامنے کی سڑکیں زرعی کالج اور عیدگاہ کی طرف جاتی ہیں۔ اس چوراہے پر زرعی کالج کے طلباء بھی جلوس میں شامل ہو گئے، مجھے ایک ڈیسک پر چڑھا دیا گیا اور پھر ''طالب علم رہنما'' زبان سے شعلے برسانے لگا۔ نوجوان خون تھا جوں جوں تقریر کے ساگر میں میں اُترتا گیا، زبان و بیان کے تمام دروبست اور فصاحت و بلاغت کے سارے دروازے مجھ پر کھلتے چلے گئے۔ پولیس نے بھی حسب روائیت جلوس کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا۔ کامیاب مقرر کے داؤ پیچ آزماتے ہوئے میں نے پولیس کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں ''قانون'' کی نظروں میں آ گیا اور ''قانون'' نے

Marfat.com

آہستہ آہستہ میرے نزدیک آنے کی حکمتِ عملی اپنالی۔ مگر طلباء کا اک جم غفیر تھا۔ اُن کی موجودگی میں پولیس مجھ پر ہاتھ ڈالنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ یہ بپھرا ہوا مجمع ٹاؤن ہال کی جانب روانہ ہوگیا۔ ہدف ٹاؤن ہال میں لگے سرکاری بورڈ تھے۔ طلباء نے جونہی ٹاؤن ہال میں لگے خاندانی منصوبہ بندی کے ایک جہازی سائز کے بورڈ پر پتھراؤ کیلئے ہاتھ آگے بڑھائے اچانک سید فضل علی شاہ کہیں سے نمودار ہوکر بورڈ کے سامنے بازو پھیلا کر کھڑے ہوگئے۔ وہ ایک ہی بات کہہ رہے تھے۔ ''یہ قومی ملکیت ہے اسے نقصان نہ پہنچاؤ''۔ طلباء کے اُٹھے ہوئے ہاتھ ہوا میں لہرا کے رہ گئے۔ معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کالج سے ہی جلوس کے ہمراہ تھے اور اُنہیں یہ ڈر تھا کہ کہیں راستے میں پولیس اُن کے ''بچوں'' سے کوئی زیادتی نہ کرے۔ میں جوشِ خطابت میں اپنی تقریر کے دوران انہیں نہ دیکھ سکا۔ اب انہیں وہاں موجود دیکھ کر مجھے ٹھنڈے پسینے آنے لگ گئے اور اپنا انجام بھی دکھائی دینے لگا۔ تھوڑی دیر میں اُن کے نوکر رحیم بخش نے مجھے کان میں سرگوشی کی۔ ''پولیس آپ کو پکڑنے والی ہے۔ میں آپ کو لینے آیا ہوں''۔ رحیم بخش نے مجھے شاہ صاحب کے سرکاری بنگلے پر جا کر ''نظر بند'' کردیا۔ شام چار بجے تک پولیس مجھے ڈھونڈتی رہی۔ شاہ صاحب آگ بگولہ ہوکر مجھ پر برستے رہے۔ جب اُن کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا تو پھر مجھے پیار کیا۔ اور آئندہ کسی ''سیاسی سرگرمی'' میں حصہ لینے سے منع کیا۔ پولیس کئی دن تک کالج کے چکر لگاتی رہی لیکن شاہ صاحب کے ڈر سے کالج کے اندر آنے کی جرأت نہ کرسکی۔ میں ایک ہفتے تک پرنسپل کے گھر نظر بند رہا۔ آج پیچھے مڑ کر ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو فضل علی شاہ مرحوم ایک درخشاں مینار کی طرح مجھے دکھائی دیتے ہیں۔ آج کے اِس عہدِ بے توقیر میں نہ وہ عظمت کے نشان اساتذہ میں نہ وہ معصوم طالب علم۔

مقدور ہو تو موت سے پوچھوں کہ اے لعین
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

Marfat.com

گورنمنٹ فرید کالج رحیم یار خان میں کیسے کیسے نابغۂ روزگار اساتذہ اکٹھے ہو گئے تھے۔ پروفیسر ریاض زیدی، پروفیسر عتیق خاوری، پروفیسر رستم خان اور پروفیسر عترت زیدی کیا لوگ تھے جو آج ناپید ہیں۔ پروفیسر عتیق خاوری سے ادب کے کسی نہ کسی موضوع پر اختلاف ہو جاتا تو ہماری بحث دنوں اور مہینوں چلتی رہتی اور پھر ریاض زیدی سے اُن کی رائے لے کر بحث کو سمیٹا جاتا۔ پیارے قاری! جب راقم ساٹھ سے آگے کی منزلوں سے گذر رہا ہے تو اکثر یہ سوچ آتی ہے کہ نہ جانے میرے محترم اساتذہ کس حال میں ہونگے۔ ریاض زیدی سے میرا آخری رابطہ 1985ء میں بذریعہ خط ہوا جب وہ عارف والا میں پرنسپل تھے۔ اور میں مردان میں اک حساس ادارے میں فرائض انجام دے رہا تھا۔ پھر رابطہ نہ ہو سکا۔ پروفیسر عترت زیدی پولیٹیکل سائنس پڑھاتے تھے۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ خالصتاً اہل زبان، نظم و ضبط اور وقت کے بہت پابند تھے۔ مجال ہے کبھی کلاس میں ایک منٹ بھی لیٹ ہوں۔ ایک دفعہ وہ قدرے تاخیر سے کلاس میں پہنچے۔ اُن سے پہلے اک ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ کلاس میں پنجابی لڑکوں کی اکثریت تھی۔ اُن کو آتا دیکھ کر ایک لڑکے نے کلاس کو وارننگ دی ''اوئے پروفیسر آوندایا'' (اوئے پروفیسر آ رہا ہے)۔ عترت صاحب نے نہ صرف یہ فقرہ سن لیا بلکہ خلاف توقع اُس کے معنی بھی سمجھ لئے۔ ڈائس پر آتے ہی انہوں نے ڈانٹ کر پوچھا ''آوندا کس نے کہا''۔ طالب علموں میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے۔ اک خاموشی تھی جو سب پر محیط تھی۔ دو تین دفعہ پوچھنے کے بعد وہ اتنا کہہ کر کلاس سے نکل گئے کہ وہ آئندہ ہمیں نہیں پڑھائیں گے۔ پیارے قاری! آپ یقین نہیں کریں گے کہ ایک ماہ تک عترت صاحب نے کلاس نہ لی۔ وہ لائبریری میں جا کر بیٹھ جاتے۔ یہ پورا مہینہ طلباء کلاس میں آنے کیلئے اُن کی منتیں کرتے رہے اور وہ ناراض کے ناراض رہے اُن کا ایک ہی مطالبہ تھا ''وہ آوندا کون تھا'' بالآخر صادق خود پیش ہو گیا۔ پاؤں پکڑ کر اُن سے معافی مانگی۔ راضی نامہ یعنی صلح ہوئی اور

Marfat.com

اس خوشی میں عترت صاحب نے پوری کلاس کو کنٹین میں چائے پلائی اور کلاس پھر زور شور سے شروع ہوگئی۔ کیا آج کے پرآشوب تعلیمی دور میں یہ واقعہ کوئی دیو مالائی کہانی نہیں لگتا؟ کیا آج کا زمانہ بھی ایسے اساتذہ اور ایسے طلباء تخلیق کر رہا ہے؟ یقیناً جواب ایک مایوسی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

ایک ہم ہیں کہ ہے لی اپنی ہی صورت بھی بگاڑ
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

ہمارے بعد آزادی حاصل کرنے والے ملکوں نے خوشحالی اور خود انحصاری کی رفعتوں کو چھو لیا ہے۔ ہم ترقی معکوس کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔ اور ہر قدم قعرِ ذلت کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ ہماری خودی ''بلند'' ہو رہی ہے۔

چالیس بیالیس سال کوئی زیادہ مدت نہیں لیکن اِن سالوں میں کوئی ایسا عمومی تغیر و تبدل آیا ہے کہ آنکھ حیران اور دِل پریشان ہے۔ اس حیران کن تبدیلی کی لپیٹ میں نہ صرف انسان آئے ہیں بلکہ ماحول اور موسم بھی مرجھا سے گئے ہیں۔ اک عجیب نفسا نفسی ہے جس میں کائنات کی ہر شے مبتلا ہے۔ اکثر صبح آفس جاتے ہوئے اور شام کو واپس آتے ہوئے میں چوراہوں، بس سٹاپوں اور ٹیکسی سٹینڈوں پر انتہائی پریشان حال سفید پوشوں کے ہجوم دیکھتا ہوں۔ اِن میں بوڑھے، جوان اور خواتین کی بڑی تعداد ہوتی ہے یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اپنے کنبوں کی کفالت کے ذمہ دار ہیں اور صبح وقت پر دفتر یا جائے فرائض پر پہنچنے کیلئے سواری حاصل کرنے کے لئے پریشان ہوتے ہیں اور شام کو تھکے ہارے لوٹتے ہوئے گھر وقت پر پہنچنے کیلئے فکر مند ہوتے ہیں۔ اِن لوگوں کیلئے ملک کے چاروں موسم خزاں کے موسم ہیں۔ یہ وہ طبقہ ہے جو ناخوشگوار تبدیلی کے ہاتھوں زخم زخم ہوا ہے۔ دیہاتوں اور مضافات کی زندگی اگرچہ اسی طرح متاثر ہوئی ہے لیکن پھر بھی وہاں حالات شہری زندگی کے مقابلے میں

Marfat.com

قدرے بہتر ہیں۔ لیکن وہاں بھی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے دودھ خریدنے والے ڈالے اور ٹینکر پہنچ گئے ہیں جو صبح شام جھاڑو پھیر کر کسانوں سے سارا دودھ خرید لیتے ہیں۔ اب وہاں بھی ملک پوڈر اور ڈبے کا ٹیٹرا ایک دودھ کسان کا بچہ پیتا ہے اور چائے بنتی ہے۔ کیا زمانہ تھا جب دیہاتی گھروں میں ''چاٹیوں'' میں دودھ اُپلوں کی ہلکی آنچ پر کڑھ رہا ہوتا تھا اور ہمہ شمہ کے لئے گھر کا دودھ غذا کا ایک حصہ ہوتا تھا دودھ کو ''نور'' کہا جاتا تھا اور دودھ بیچنا اک گناہِ کبیرہ تصور ہوتا تھا۔ جب کسی گھر کا کوئی دودھ دینے والا جانور بکتا تھا تو یہ اُنکے قلاش ہو جانے کی علامت ہوتی تھی۔ اردگرد کے لوگ ایسے گھر میں پرسا دینے آتے تھے۔ یہ بات محض برائے نگارش نہیں لکھ رہا۔ اُس وقت حقیقت یہی تھی جو اَب افسانہ سا لگتا ہے۔ دو سال قبل اسلام آباد کے شور شرابے سے کچھ عرصے کیلئے جان چھڑانے اور سکھ کا سانس لینے کے لئے میں گاؤں بھاگ گیا۔ بہار کے دن تھے مگر بستی میں مجھے صرف کائیں کائیں کرتے اور چور مچاتے کوّوں کے غولوں کے سوا کوئی پرندہ نظر نہ آیا۔ قمریاں، فاختائیں، کوئلیں اور بلبلیں کبھی ڈال ڈال بولا کرتی تھیں۔ میں نے اک بزرگ سے اِن انسان دوست پرندوں کے غائب ہونے کی وجہ معلوم کی تو پتہ چلا کہ یہ سب خوبصورت پرندے زہریلی کیمیاوی کھادوں کی نذر ہو گئے ہیں۔ شروع شروع میں جب کھاد کا بے محابہ استعمال شروع ہوا تو کھیتوں میں جہاں تہاں اِن معصوم پرندوں کی لاشیں ملتی تھیں۔ جب سے یہ پرندے ناپید ہوئے ہیں فصلوں کے دشمن کیڑے مکوڑوں اور سنڈیوں نے اک تباہی پھیلا دی ہے۔ ایسی ایسی زہریلی کھادیں ہیں کہ اگر ایک دانا بھی کسی فرد کے حلق میں چلا جائے تو فوری موت واقع ہو جائے۔ مصنوعی کھاد کی پروردہ فصلوں نے ہمیں ہزاروں لاعلاج بیماریوں کا تحفہ دیا ہے۔ مغرب نے اپنے ملکوں میں مصنوعی کھاد کا استعمال بند کر کے اُسے قابل تعزیر جرم قرار دے دیا ہے۔

Marfat.com

لیکن تیسری دنیا کیلئے دھڑا دھڑ مہلک زرعی کھادیں اور ادویات باہم پہنچا رہا ہے۔ میں اپنے موضوع سے ذرا ہٹ رہا ہوں۔ میرے پیارے قاری! آج کی نشست کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ اگر زندگی رہی تو انشاءاللہ اگلی نشست میں ماضی کے موسم اور اُن موسموں کے تعلیمی ماحول سے تعلیق پر بات کروں گا۔

یار زندہ صحبت باقی

Marfat.com

یادوں کے گلاب (۴)

پیارے قاری! گزشتہ نشست میں گئے موسموں اور بیتی رتوں کی بات چل رہی تھی کہ کس طرح سب کچھ ایک منفی تغیر کی نذر ہو گیا۔ سماجی اور معاشرتی تبدیلیوں نے ہمارے روائتی رسم ورواج اور تمدن کو نگل لیا۔ سائنس کی ترقی نے زندگی کو مکمل میکانکی بنا کر رکھ دیا ہے۔ نفسانفسی کا اک جال ہے جس نے پوری حیات کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ کہاں گئے وہ چند سکھ کے سانس جو تہواروں، میلوں ٹھیلوں کی صورت میں انسان کو میسر تھے۔ عید بقر عید پر کیسی خوشیاں نظر آتی تھیں۔ چاندرات کو کس طرح سبھاؤ سے منایا جاتا تھا۔ عید گاہوں مین رونقیں کیسا روح پرور منظر پیش کرتی تھیں۔ گھروں میں کیسے کیسے پکوان پکتے تھے۔ برادریوں کے ناراض لوگ کس طرح انا کی اونچی دیواریں پھاند کر اک دوسرے کو منانے کیلئے مخالف کے گھر پہنچ جاتے تھے۔ عیدوں پر لباس کیلئے کتنے اہتمام ہوتے تھے۔ ہر موسم ایک سندیسہ دیتا تھا۔ زندگی میں گرچہ لوگوں کو عسرت اور تنگدستی کا سامنا رہتا تھا لیکن زیادہ معاشی افراط وتفریط نہ ہونے کی وجہ سے لوگ زندگی سے مطمئن تھے۔ اگر کوئی سماجی اور معاشی تفاوت تھا تو بڑے شہروں اور صنعتی علاقوں میں تھا۔ چھوٹے شہروں اور پسماندہ علاقوں میں زندگی بڑے دھیرے قدم سے چل رہی تھی۔ اب تو اوزون کی وجہ سے موسموں کی شکلیں اور اُن کی شدتیں بھی بگڑنا شروع ہو گئی ہیں لیکن آج سے چالیس پچاس سال پہلے زیریں پنجاب میں سرما کا موسم تقریباً بہار کا موسم ہوتا تھا۔ بڑی نرم سی دھوپ ہوتی تھی۔ کپاس، گنا، لوسن، شوتالہ اور برسین کے سرسبز کھیت میلوں تک پھیلے ہوتے تھے اور آنکھ اُن سے شادابی اور سکون کشید کرتی تھی۔ موسمِ گرما کی شدت

Marfat.com

کے بعد ''روپہلی دھوپ والا سرما طالب علموں کے لئے بڑی خوشیاں لاتا تھا۔ سرما میں کھیلوں کے مقابلے ہوتے تھے۔ طلباء یونین کے انتخابات ہوتے۔ کالجوں میں بین الکلیاتی مباحثے ہوتے۔ مشاعرے سجتے، فائرکیمپ لگائے جاتے ڈرامے اسٹیج کئے جاتے، اکتوبر کے آخر سے شروع ہونے والا غیر نصابی سرگرمیوں کا یہ سلسلہ فروری آنے تک ختم ہو جاتا اور پھر طلباء سنجیدگی سے اپریل میں منعقد ہونے والے امتحانوں کی تیاری میں جُت جاتے۔ تمام غیر نصابی سرگرمیاں معطل ہو جاتیں۔ سب طلباء شب خیز ہو جاتے۔ سنجیدگی ہر سو پہرے ڈال دیتی۔ خدا جانے یہ کرکٹ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی زندگی میں کب در آئی۔ ہمارے زمانے میں بالترتیب فٹ بال، ہاکی اور باسکٹ بال ایک طرح کی سرکاری کھیلیں ہوتی تھیں۔ ڈیڑھ گھنٹے میں ہار جیت کا فیصلہ ہو جاتا تھا۔ اس ڈیڑھ گھنٹے میں دونوں طرف کے کھلاڑی جانگسل کوشش کے ساتھ برتری حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ اس ڈیڑھ گھنٹے کی جان توڑ سعی میں کھلاڑی اتنی جسمانی ورزش کر لیتا جو کرکٹ کا کوئی کھلاڑی پورا ٹیسٹ میچ کھیلنے پر بھی نہیں کر پاتا۔ کرکٹ کا یہ منظر توٹی وی اکثر دکھاتا رہتا ہے کہ فیلڈنگ کیلئے کھڑا ہوا کھلاڑی جمائیاں لے رہا ہے یا اپنے آپ کو گرم رکھنے کے لئے ورزش کر رہا ہے۔ گیند آ گئی تو تھوڑی سی دوڑ لگ گئی ورنہ وہ کھڑا ہے۔ کامن ویلتھ کے نوآبادیاتی ملکوں کو یہ تحفہ انگلینڈ نے دیا ہے۔

پیارے قاری! میں زیریں پنجاب میں گذرے موسموں کے حوالے سے سرما کی نرم اور روپہلی دھوپ، آنکھوں کو تراوٹ بخشنے والے دور دور تک پھیلے ہوئے سبزے کی بات کر رہا تھا۔ آج تو ہر دس کلومیٹر کے بعد ایک شوگر مل چینی تیار کر رہی ہے لیکن میرے جوانی کے زمانے میں بہاولپور ڈویژن میں صرف ''جیٹھہ بھٹہ'' کی ایک مل تھی۔ چنانچہ بیلنوں کا کلچر اپنے عروج پر تھا۔ گنے کی پیداوار بہت تھی۔ نتیجتاً آپ کو جہاں تہاں کھیتوں میں بیلنے گڑ اور دیسی کھانڈ اور شکر بناتے ہوئے نظر آتے ان بیلنوں پر دیہاتوں

Marfat.com

میں دِن رات اک سرخوشی اور میلے کا سماں رہتا تھا کیونکہ کپاس اور گندم کے بعد دہقان کیلئے یہی گڑ شکر آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہوتا تھا۔ گنے کے کھیتوں کے درمیان کھلی جگہ سے اُٹھنے والا دھواں جہاں بیلنے کی موجودگی کا پتہ دیتا تھا، وہاں دیہاتیوں میں یہ خیر و برکت اور خوشحالی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ گورنمنٹ کالج رحیم یارخان میں صادق آباد سے روزانہ سفر کرنے والے طلباء کا ایک گروپ ایسا بھی تھا جسے ''سر پھرہ ٹولہ'' کہا جاتا تھا۔ نومبر سے فروری تک اِس ٹولے کی غیر نصابی سرگرمیاں عروج پر ہوتی تھیں۔ یہ غیر نصابی سرگرمیاں کیا تھیں؟ ہر ہفتے کو کالج سے فارغ ہو کر طلباء کا یہ پندرہ افراد کا گروپ ریلوے اسٹیشن پر جمع ہو جاتا اور پھر تقریباً بارہ بجے دوپہر صادق آبا تک 27 کلو میٹر کی واک شروع ہوتی جو رات گئے اپنے شہر جا کر ختم ہوتی۔ آج میں اپنے بچوں کو یہ حقیقت بیان کرتا ہوں تو وہ بڑی بے اعتباری سے میری بات سنتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ ذہن میں سوچتے ہوں کہ بابا جی لمبی چھوڑ رہے ہیں۔ کیونکہ وہ ہمارے دور کے نوجوان بھی تو نہیں رہے۔ مسلسل کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ بیٹھ کر بچوں کی کمریں دوہری ہو گئی ہیں۔ اُن کے ''لک'' ٹوٹ چکے ہیں۔ تمام گیمیں گھروں میں ٹیلیویژن پر دیکھی جاتی ہیں۔ اپنے جسم کو مضبوط اور توانا رکھنے کا کلچر ہی باقی نہیں رہا۔ ہڈیوں کے ڈھانچے، معنک اور مدقوق چہرے، یہ نئی نسل ہے۔

پیارے قاری! دوپہر بارہ بجے 27 کلومیٹر کی شروع ہونے والی واک پانچ سے چھ گھنٹے یا کچھ زیادہ میں جا کر مکمل ہوتی۔ ہم جب اپنے اپنے گھر پہنچتے تو عشاء کی آذان کا وقت ہو چکا ہوتا۔ آگے چچا محترم وضو بنا رہے ہوتے جو اس بات کی علامت ہوتی کہ ہم نے پہلے نماز پڑھنی ہے اور پھر ہمیں کھانا ملے گا۔ میری وہ اک نماز کروڑوں نمازوں پر بھاری ہوتی تھی۔ 27 کلومیٹر پیدل سفر کر کے آنے والے تھکے ماندے اُس طالب علم کی حالت کا تصور کیجئے جس نے منزلِ مقصود پر پہنچ کر تھکن اُتارنے کی بجائے

Marfat.com

ٹوپی پہن کر سیدھا مسجد کا رُخ کرنا ہو اور جہاں مولانا صاحب پہلے ہی قلم بگوش حاضری کی کاپی پر دستخط کرنے کیلئے تیار بیٹھے ہوں۔ جس دن یہ شاہانہ واک ہوتی تھی تو ہمارا دوپہر کا کھانا راستے میں پڑنے والے گنے کے کھیتوں، شلجم کی واڑیوں اور مولی گاجر کی پیلیوں سے پورا ہوتا تھا۔ اُس زمانے دہقان بھی بڑے ظرف کا ہوتا تھا۔ کھیتوں کو اُجاڑنے پر کبھی کسی نے تعرض نہیں کیا۔ بلکہ خوش ہوتے کہ ''کالجی منڈے'' اُن کے مہمان ہوئے ہیں۔ ہمارا ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے یہ سفر گرم گرم گڑ کھاتے، رو اور ککو پیتے، تازہ شلجم، گاجریں اور مولیاں کھاتے ہوئے اپنے اختتام کو پہنچتا۔ میں سوچتا ہوں کہ آج کا طالب علم کتنا بدنصیب ہے۔ ٹیکنالوجی اور سائنس کی بگٹٹ دوڑتی ہوئی زندگی نے کیسے کیسے خوبصورت رنگ اُس سے چھین لئے ہیں۔ صبح میری نازک نفیس سی پانچ سالہ پوتی جب اپنے جسم سے دگنے وزن کا بستہ اپنی پیٹھ پر لاد کر افتاں وخیزاں اپنی وین کی طرف دوڑتی ہے تو اُس کی مجبوری کا تصور کر کے مجھے رونا آجاتا ہے۔ خدا جانے یہ ترقی معکوس ہمیں کہاں لے جائے گی۔ ہم ''بے بنیادے'' ہو چکے ہیں۔ اپنی اقدار ہم سے چھوٹ گئیں اور ہم مغرب کی خوبیاں نقل کرنے کے باوجود انہیں اپنا نہ سکے۔ وہی خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم والی بات ہوئی۔ قومیں آزاد ہوتی ہیں تو اُن کا ہر قدم آگے کی جانب اُٹھتا ہے۔ ہم آزاد ہوئے تو ہمارا حال بد سے بدتر ہوتا چلا گیا۔ جب بین الاقوامی اخبارات ورسائل میں اپنے ''اعمال'' پڑھتا ہوں تو مجھے کئی دفعہ اپنے پاکستانی ہونے پر شرمن [illegible] تی ہے۔ خیر سیاست، معاشرت، معاش اور رویوں پر گفتگو شروع ہوئی تو سلسلہ دراز ہو جائے گا۔ اور یہ میرا موضوع نہیں۔ میں تو اپنے سادہ مُرادے ماضی کے خوشگوار اور رنگارنگ واقعات آپ سے شیئر (Share) کر رہا ہوں۔ تلخیاں اُس وقت بھی زندگی میں موجود تھیں۔ لیکن اُن میں وہ زہر نہیں گھلا ہوا تھا جس سے آج ایک غریب اور متوسط شخص کی زندگی دوچار

ہے۔

Marfat.com

موسم سرما میں تعلیمی اور غیر تعلیمی سرگرمیوں کی طرف چلتے ہیں۔ میرے زمانے میں دائیں بازو اور بائیں بازو کی وباء ابھی نہیں پھوٹی تھی۔ طالب علم صرف طالب علم تھا۔ اُسے غلیظ سیاست کی گھمبیر تاؤں کا علم تھا نہ شعور۔ لے دے کے اگر اسلامی جمعیت اور مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام سے دو تنظیمیں موجود تھیں تو یہ بھی صرف بڑی اور قدیم یونیورسٹیوں میں اپنا اثر و نفوذ رکھتی تھیں۔ وہاں بھی اِن کے کارندے صرف نئے داخلوں اور یونین کے انتخابات کے موقعوں پر ہی سرگرمِ عمل نظر آتے تھے۔ کبھی نظریاتی سطح پر طلباء کا تصادم نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی کبھی رنجشیں اور دُشمنیاں اِس انداز میں پالی جاتیں کہ مقصد صرف اور صرف مخالف کی جان لینا ہو۔ آج طالب علم معصوم نہیں رہا۔ وہ شدت اور تشدد پسند ہے اپنے صحیح یا غلط نظریئے سے انتہا کی حد تک وابستہ ہے اور ایک مجرم کی طرح اپنے نظریئے کو سچا ثابت کرنے کے لئے کسی بھی حد تک چلا جاتا ہے۔ اِس دُکھی صورت حال میں پچیس فیصد قصور طالب علم کا ہے اور پچھتر فیصد سیاسی مافیا اور دیگر ایجنسیوں کا ہاتھ ہے۔ نوجوان تو ایک کونپل ہے۔ آپ نے اُسے جہاں موڑا وہ مڑ گئی۔

موسم سرما کے آغاز سے ہی مباحثوں، مشاعروں اور ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا یہ ساری سرگرمیاں کالج کی سٹوڈنٹس یونین کرواتی تھی۔ یادوں اور حافظے پر وقت کی دُھول پڑ گئی ہے۔ میری یادداشت کے مطابق نئے تعلیمی سال کے شروع ہوتے ہی سٹوڈنٹ یونین کے انتخابات بھی منعقد ہو جاتے تھے۔ پریذیڈنٹ فورتھ ائیر سے وائس پریذیڈنٹ تھرڈ ائیر سے، جنرل سیکرٹری سیکنڈ ائیر سے اور جائنٹ سیکرٹری فرسٹ ائیر سے چُنا جاتا تھا۔ ایک پروفیسر یونین کے انچارج بنا دیئے جاتے تھے۔ بڑے ہی شائستہ انداز میں انتخابات کی تیاری ہوتی تھی۔ شروع میں تو ہورڈنگ آویزاں کرنے کا بھی رواج نہیں تھا لیکن آہستہ آہستہ اتنا ہوا کہ کلاسز سے باہر لیکن کالج کی حدود میں کپڑے کے بینرز وغیرہ لگانے کی اجازت مل گئی جس میں اُمیدوار کے منشوری نعرے

Marfat.com

لکھے ہوتے۔ اُمیدواروں کے لئے طلباء کے اجتماع کو خطاب کرنا ایک اہم تقریب ہوتی۔ جس میں سب اُمیدوار باری باری اسٹیج پر آ کر تقریر کرتے۔ کالج انتظامیہ ایسے اجتماع کے انعقاد کے لئے کلاسوں کی چھٹی کر دیتی۔ سینئر اساتذہ اجتماع کے ارد گرد کسی نہ کسی صورت میں موجود رہتے۔ براہِ راست اُستاد کسی قسم کی مداخلت نہ کرتے۔ کہیں پسند اور ناپسند کے معاملے میں اُستاد فریق بننا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ جتنی اچھی لیڈرشپ کی تربیت اساتذہ نے میرے دور تک کی، اُس کی نظیر بعد کے زمانوں میں کبھی نہ ملی۔
باقی داستان اگلی نشست میں بشرطِ زندگی بیان کروں گا۔

Marfat.com

حسن کا کباڑیہ.....راسپوتین ڈیروی

میں نے ایک دن اُس سے کہا کہ یار تم یہ جو دھند میں لپٹی اور گرد میں اٹی عینک اوڑھے رہتے ہو کبھی اس کے محدب عدسے صاف کرلیا کروتا کہ رنگین دنیا کو پوری رنگینی کے ساتھ دیکھ سکو۔ اُس نے ٹھنڈی آہ بھری اور کہنے لگا۔ ''میں عینک کے شیشے صاف کر لوں تو ابکائی آنے لگتی ہے''۔ ظالم نے عجب چیستان جواب دیا تھا۔ بہر حال میرا استفسار اور اصرار بڑھا تو سرگوشی میں فرمایا۔ ''تم تو جانتے ہو میرے اردگرد کچھ چاند چہرہ اور خوش خصال اکٹھے ہوتے ہیں۔ جب محدب عدسے دھندلے ہوں تو میں خود بھی نرگسیت کا شکار رہتا ہوں اور یہ سب لوگ بھی پری جمال دکھائی دیتے ہیں۔ میری طبیعت بہلی رہتی ہے۔ عدسے صاف کرلوں تو ان لوگوں کو دیکھ کر ابکائی آنے لگتی ہے''۔ اس وضاحت کے بعد میں نے آج تک اُس سے عدسے صاف کرنے کی فرمائش نہیں کی۔ میرا دوست حسن کا کباڑیہ ہے اور اس کے دل کی دکان زمانہ قبل از تقسیم ہند کے حسن سے بھری پڑی ہے۔ وہ اپنے کباڑ کے ساتھ خوشحال و نہال ہے۔ یہ مرتبہ بھی داتا کی دین ہے اور میں غفار بابر سے یہ مرتبہ چھیننا نہیں چاہتا۔

ہر دانشور چند وضعداریوں میں گھرا رہتا ہے اور یہی وضعداریاں اُس کی پہچان بن جاتی ہیں۔ بابر میں کبھی کبھی مجھے ساغر صدیقی نظر آتا ہے۔ بابر جس دن زیادہ میلا کچیلا پھر رہا ہو تو وہ زیادہ چہکتا ہے۔ اور مجھے اسی وقت پتہ چل جاتا ہے کہ وہ اپنے کسی معمر معشوق سے مل کر آرہا ہے۔ اس کے بال زیادہ الجھے الجھے اور میلے ہوں، اس کا لباس شکن در شکن ہو اور ہاتھوں کے ناخن میل سے اٹے ہوں تو یوں سمجھئے کہ اس کی پانچوں گھی میں

Marfat.com

ہیں اور یقین کر لیجئے کہ وہ قطار اندر قطار عفیفاؤں'' میں گھرا ہوا ہے۔اور یوں جانئے کہ ان دنوں اس کی موجیں کسی صورت راجہ اندر سے کم نہیں ہیں۔جس دن وہ اجلا اجلا سا نظر آتا ہے تو سوگوار ہوتا ہے۔اسے چپ لگی ہوتی ہے۔اس دن وہ کسی سفید بالوں والی سے الجھ کر آیا ہوتا ہے۔کسی دبیز چشمے والی نے اس کا دل دکھایا ہوتا ہے۔اس کے علاوہ ہماری بھابی محترمہ کو جس دن غفار بابر خودکشی کی دھمکی دے تو خوب نہا دھو کر، کپڑے بدل کر اور بال بنا کر باہر نکلتا ہے اس دن وہ حرماں نصیب جہاں تہاں اس کے دوستوں کو ٹیلیفون کر کے اس کے تمام ٹھکانوں پر اس کا تعاقب کرتی رہتی ہے کہ کہیں سچ مچ مستانہ ماہی خودکشی نہ کر لے لیکن بابر کو اس بات کا پورا احساس ہے کہ اس کی خودکشی سے اس کے حقیقی گھر کے علاوہ کئی اور بے واؤں اور ''اللہ راسیوں'' کے گھر بھی تاریک ہو جائیں گے۔اور جن سفید سروں پر اس نے شفقت کا ہاتھ رکھا ہوا ہے، وہ بے سہارا ہو جائیں گے۔ بابر کی خواہشات اس لحاظ سے بڑی محدود ہیں کہ وہ بازار سے بیس روپے کلو والا تازہ، میٹھا اور رس بھرا آم لینے کی بجائے پاوندے کی ریڑھی سے آٹھ روپے کلو والا کل کا بچا ہوا، رس دمیدہ کھٹ میٹھا کا ٹھا آم کھانا پسند کرتا ہے۔وہ اتم درجے کا غنی ہے اور اس کی غنا اس کے اردگرد بکھرے ہوئے ''آثارِ قدیمہ'' نما وہ خوش چہرہ لوگ ہیں جنہیں بابر ہمیشہ بلبلانِ دست آموز کہتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ بابر بڑا معصوم، قناعت پسند اور سیر دل آدمی ہے۔
وہ کھیلنے کیلئے چاند نہیں مانگتا، ایسی عجائز پر اکتفا کر لیتا ہے جن کے سر پر چاندنی اُتری ہوئی ہو اور ان راندۂ شباب لوگوں میں وہ اپنے من کی تسلیوں کے خوب خوب سامان پیدا کر لیتا ہے۔راسپوتین کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ دنیا کا غلیظ ترین آدمی تھا مگر کوئی ایسا جادو ٹونا اس کے ہاتھ میں تھا کہ روس کی حسینائیں اس کے پاؤں کی مٹی آنکھوں کو لگانے کیلئے دعائیں مانگتی تھیں۔اور تو اور زرینۂ روس اس کی شوربے میں لتھڑی ہوئی گندی انگلیوں کو چاٹنا اپنے لئے سعادت سمجھتی تھی۔راسپوتین کے پاس کوئی کالا علم تھا؟ اتنا تو مجھے

Marfat.com

معلوم نہیں لیکن جب غفار بابر اور راسپوتین کا تقابلی جائزہ لیتا ہوں تو مجھے یقین سا ہو جاتا ہے کہ راسپوتین کے پاس بھی گیدڑ سنگھی تھی جیسی غفار بابر کے پاس ہے۔ بڑی منتوں، سماجتوں کے بعد اُس نے ایک دن وہ ڈبی نکال کر مجھے زیارت کرائی تھی جسے میں ہمیشہ نسوار کی ڈبی سمجھ کر نظر انداز کرتا رہا۔ یہ بالوں والی ایک زردسی کوئی چیز تھی جو سندور میں تر تھی۔ اس مخلوق کے بارے میں تفصیلات بتاتے ہوئے جب اس کی طبیعات پر روشنی ڈالنے لگا تو غفار بابر کا لہجہ کافی سنجیدہ اور درد بھرا تھا۔ کہنے لگا کہ اس گیدڑ سنگھی کی عمر تقریباً ساٹھ سال ہے۔ گذشتہ دو دھائیوں سے کوشش کر رہا ہوں کہ کوئی جواں سال گیدڑ سنگھی ہاتھ لگے تو اس بیچاری کو آزاد کر دوں۔ اس نے میرا بڑا نقصان کرایا ہے۔ میں نے اس وقت بابر کے اس فقرے پر دھیان نہیں دیا۔ لیکن بعدازاں جب ٹھنڈے دماغ کے ساتھ غور کیا تو غفار بابر کی بوڑھی محبوباؤں اور اس گیدڑ میں ایک طبعی ربط مجھے محسوس ہوا۔ اور غفار بابر کی بعض مجبوریوں کے عقدے کھلتے چلے گئے۔ جواں سال گیدڑ سنگھی کیلئے بابر کی تڑپ کا معمہ بھی حل ہو گیا۔ اور اس نقصان کا اندازہ بھی ہوا کہ بوڑھی گیدڑ سنگھی نے کس طرح غفار بابر کی جوانی ''عجوزاؤں'' میں بانٹ دی۔ لیکن سنا ہے کہ وہ جب سے باشرع ہوا ہے جواں لڑکیاں بھی پاکباز جان کر اعتبار کھانے لگی ہیں۔ لیکن وہ نظر لگنے سے بچنے کیلئے اقرار نہیں کرتا۔ حالانکہ میں اسے یقین دلا چکا ہوں کہ میں بہت بے ضرر اور بیبا سا آدمی ہوں۔ کسی کی معشوق مارنا تو دور کی بات ہے میں آج تک بری نیت کے ساتھ اپنی بیوی کو آنکھ بھی نہیں مار سکا۔ بہر حال بدگمانی کا کوئی علاج نہیں ہے۔

غفار بابر بڑا انٹ کھٹ اور شریر آدمی ہے۔ لوگوں کو آپس میں لڑا کر دور کھڑا مسکراتا رہتا ہے۔ بارہا گہرے دوستوں کو لڑانے میں کامیاب ہو کر مجھ سے شرطیں جیت چکا ہے۔ اس کا ایک معرکہ تم بڑا یادگار ہے اور مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ میں دو اچھے دوستوں کا نام لے کر اڑ گیا کہ بابر تو ان کو آپس میں کبھی لڑا نہیں پاؤ گے۔ شرط لگ گئی۔

Marfat.com

مدت گذر گئی، بات رفت گذشت ہوگئی۔ ایک سہانی صبح کیا دیکھتا ہوں کہ ان دوستوں کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف اخبارات میں بیان لگے ہوئے ہیں اور پھر نوبت ایک دوسرے کو قانونی نوٹس دینے تک پہنچ گئی۔ واقعہ اس طرح ہوا کہ ان دو معصوم دوستوں میں سے ایک صاحب کسی بزم ادب کے صدر بنائے گئے۔ شاعر بیچارہ ہوتا تو جہنمی مخلوق ہے۔ بے عملی، کاہلی، سستی اور خیالی ادھیڑ بن ہی اس کی دنیا ہوتی ہے۔ مذکورہ صدر صاحب اک عرصے تک اجلاس نہ بلا سکے۔ یہ شرارتی دانشور اس بزم ادب کا سیکرٹری تھا۔ اسے میرے ساتھ بدی ہوئی شرط بھی یاد تھی۔ اُس نے دوسرے معصوم دوست کو ''چک چکا'' کر کسی منشوری جواز پر بزمِ ادب کا صدر بنا دیا اور خود سیکرٹری بن گئے۔ پھر معزول ہونے والے صدر کے پاس گئے۔ اسے اپنے ہاتھ سے نوٹس لکھ کر دیا۔ آنجناب کے دستخط کروائے اور نوٹس برائے تعمیل بھیج دیا۔ پھر واپس نئے صدر کے پاس پہنچے۔ نوٹس کو بڑی فکر مندی اور سنجیدگی سے پڑھا۔ اُس کا جواب بنایا۔ صدر معصوم سے دستخط کروائے اور معزول صدر کو بھجوا دیا۔ بعد میں ہم لاکھ کوشش کرتے رہے۔ دونوں دوستوں کے درمیان صلح بھی ہوگئی مگر دلوں کے دھندلائے ہوئے آئینے صاف نہ ہو سکے۔ میں غفار بابر سے ہمیشہ ڈرتا رہتا ہوں اور اس کی خوشامد اور ''اَس تَس'' کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ خدا جانے کس منحوس گھڑی یہ شخص ایسا ماحول پیدا کر دے کہ میں گھر جاؤں تو نیک بخت مجھے گھر کے دروازے پر ہی سے یہ کہہ کر لوٹا دے کہ ''جاؤ اُسی بیرنیا کے ہاتھ کا پکا کھاؤ جس کے ہاں مشاعرے کا بہانہ کر کے دادِ عیش دینے چلے جاتے ہو''۔ سلطان مجاہد اور بابر دوست ہیں۔ دونوں میں بعد المشرقین ہے۔ سلطان مجاہد انتہا کا سنجیدہ اور بلا کا شریف آدمی ہے۔ لیکن خلوص کے بندوں کی ایک خامی ہوتی ہے۔ یہ ستم ظریف بڑے خلد باز ہوتے ہیں۔ سلطان پر لیس پر اچھے خاصے ادبی ماحول کا منظر ہوتا ہے کہ بابر کی رگِ شرارت پھڑک اٹھتی ہے مجھے آنکھ مار کے کوئی ایسی ناگوار سی بات کر جائے گا کہ سارا

Marfat.com

ماحول تلپٹ ہو جاتا ہے۔ سلطان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو جاتا ہے اور یہ ظالم ہنہنا رہا ہوتا ہے۔ جلتی پر تیل کا عمل شروع رہتا ہے۔ لیکن کمال یہ ہے کہ باہمی کدورتوں، رنجشوں اور ذاتی عناد کے باوجود بابر نے کبھی سلطان مجاہد کی دوستی کا دامن نہیں چھوڑا۔ حالانکہ وہ بارہا اپنا دامن جھٹک چکا ہے۔

غفار بابر بزم آرا شخص ہے۔ اور بابر باہر کے ادبی حلقوں میں ڈیرہ کی پہچان ہے۔ جانے کس کا بھلا سا شعر ہے جو غفار بابر پر صحیح اترتا ہے۔

زمین شہر تیری آبرو فقط ہم میں
ہمارے بعد تیرا کس نے نام لینا ہے

بابر ڈیرہ کے حوالے سے میرے چند قدیم ترین شناساؤں میں سے ہے۔ اُس سے میرا تعلق معمول کی ادبی شناسائی سے شروع ہوا اور آج دوستی اور خلوص کی راہیں طے کرتا ہوا باہمی رفاقت و احترام میں بدل چکا ہے۔ اس نے ہمیشہ میرا احترام کیا ہے اور بے تکلف دوستی کے باوجود احترام کی حدود عبور نہیں کیں۔ میں نے کہا کہ وہ بزم آرا شخص ہے۔ جس ادبی محفل میں غفار بابر نہ ہو، وہ سونی سونی اور ادھوری سی رہتی ہے۔ اور جس نشست کا انتظام و انصرام اس کے اپنے ہاتھ میں ہو، وہاں رنگ و نور اور خوشبوؤں کا سیلاب امڈ آتا ہے۔ محفل خود بخود رنگین ہو جاتی ہے۔ بہت سی خوبیوں کا مالک ہے۔ شاعر گر ہے اور کئی بدنصیبوں کے اچھے خاصے روزگار مروا کے انہیں شاعر بنا چکا ہے۔ جس نوجوان کی بغل میں ایک نئی سی ڈائری نظر آئے اور وہ کسی ادبی نشست میں نظر آئے تو سمجھئے کہ وہ کشتۂ غفار بابر ہے۔ اپنی سجنیوں کو تقریریں لکھ لکھ کر دیتا ہے۔ اُن میں سے پچاس فیصد سیاسی لیڈر بن چکی ہیں، جو بچ گئی ہیں انہیں خلوتوں میں شاعری کے زیر و بم سمجھتا رہتا ہے۔ کیا آسودہ اور مخفف سی زندگی گذار رہا ہے یہ شخص۔ غفار بابر سے اُس کی آنے والی کتاب کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی تو میں نے خواہش ظاہر کی کہ میں بھی

Marfat.com

اس پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ چند دنوں بعد غفار بابر صاحب کی طرف سے مجھے ایک خاکی لفافہ ملا۔ جس پر زنانہ تحریر میں لکھا تھا ''محترم جناب غفار بابر کی خدمت میں بصد خلوص و عقیدت'' اور نیچے کسی ہیڈ مسٹرس کا نام تھا۔ لفافے میں غفار بابر کے چند شعری نمونے تھے، جن پر مجھے لکھنا تھا۔ لیکن خط کا موضوع تو برطرف ہوا اور میرا قلم لفافے کی تحریر میں الجھ کر رہ گیا۔ میں نے پہلے کہا ہے کہ غفار بابر بڑا چالاک آدمی ہے۔ حقوق ملکیت چھن جانے کے خوف سے اس نے کبھی ''کسی'' سے مجھے متعارف نہیں کرایا۔ لیکن وہ ڈال ڈال تو ہم بات پات۔ میرے خیال میں اس کے پچھتر فیصد راز میں جان گیا ہوں۔ اب جو اس کی غزلوں کو لے کر بیٹھا ہوں تو میرے دماغ کے نہاں خانے میں غفار بابر کے خداوندان حسن کے چہرے باہم گڈمڈ ہونا شروع ہو گئے۔ اور مجھے سمجھ نہ آئے کہ کس پری پیکر کا پیمانہ ذہن میں رکھ کر میں بابر کے فنی معیار پر لکھوں۔ بالآخر یہ سوچ کر کہ بابر کے شعری سفر کی باتیں لکھنے والے تو کئی اساتذہ اور معتبر ادبی شخصیات ہوں گی۔ میں بابر کے ذاتی حوالوں پر کچھ لکھوں۔ بابر بڑے ظرف والا آدمی ہے۔ میں نے اس سے کہا ''میں تم پر خاکہ نگاری کرنا چاہتا ہوں''۔ بلاتامل اس کا جواب تھا کہ 'یہ میرے لئے اعزاز ہوگا۔ میں بلاکم و کاست تمہاری لکھی ہوئی تحریر اپنی کتاب کی زینت بناؤں گا''۔ یہ اس سیدھے سادے بھولے بھالے سے دانشور کا بڑا پن ہے۔ میں نے غفار کی غزلیں محفوظ کر لی ہیں۔ انشاء اللہ جب اس کا مجموعہ چھپ کر آئے گا تو تقریب رونمائی میں غفار بابر پر فنی گفتگو مجھ پر قرض رہی۔ میں غفار بابر سے ''لبرٹی'' لے سکتا ہوں کیونکہ مجھے اس کی دوستی پر مان اور فخر ہے۔ اور اسی وجہ سے میں نے اس کی شخصیت کے ہلکے پھلکے پہلو کو مصالحہ لگا کر پیش کر دیا ہے۔ اور نتائج اخذ کرنے کا فریضہ قاری کے ظرف پر چھوڑ دیا ہے۔

غفار بابر اس لحاظ سے ایک اعلیٰ انسان ہے کہ اپنی شکست و ریخت اور ذاتی محرومیوں کا کبھی کسی سے تذکرہ نہیں کیا۔ اس پر یہ شعر بھی صادق آتا ہے۔

Marfat.com

آوازِ شکست دِل لب پر نہ میرے آئی
شیشے میں سمیٹی ہے ہے شیشے کی صدا میں نے

میں بابر کی گھمبیرتا کو جانتا ہوں۔ وہ ایک سیلف میڈ آدمی ہے۔ اس نے زندگی کا راستہ اپاہج شخص کی طرح ''گھسیٹ'' کر طے کیا ہے اور پتھریلی راہوں سے زخم زخم ہو کر گذرا ہے۔ وہ گذشتہ پچیس سال سے گھریلو محرومیوں کا شکار ہے اور مدقوق بیوی کے ساتھ بچوں کو پال پوس رہا ہے۔ اس سے قبل بھی اس نے زندگی سے سکھ نہیں پائے۔ لیکن وہ بہادر شخص گنگناتی ہوئی ندی کی طرح معاشرے میں ایک خوش وخرم شخص کا تاثر دیتا ہے۔ میں نے اسے گھریلو مسائل کبھی کسی کے ساتھ ''ڈسکس'' کرتے نہیں دیکھا اور کبھی قسمت کا گلہ شکوہ کرتے نہیں سنا۔ وہ رجائیت پسند ہے۔ خدا ہر ایک کو بابر جیسا حوصلہ دے اور حسیناؤں کے سلسلے میں اس جیسی قسمت عطا کرے۔ آمین

Marfat.com

ایک عزیز کے نام خط

عزیز محترم!

السلام علیکم! اللہ کی ہزاروں رحمتیں ہوں آپ پر۔ آمین

آپ کی خوبی تحریر مجھے اپنی گرفت میں جکڑے چلی جاتی ہے۔ آپ جیسی لائق اولاد نیک والدین کی طرف سے اک صدقۂ جاریہ ہوتی ہے۔ آپ کا حسنِ کلام سعادت مندی، مؤدب لہجہ اور ابا مرحوم کے جاننے والوں سے آپ کی عقیدت وہ خوبیاں ہیں جو آپ کے جسم میں دوڑنے والے صالحہ خون کی عطیہ ہیں۔ ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔ آپ نے میرے مکتوب کو اتنی پذیرائی دی۔ مجھے شرمندگی سی ہوئی کہ نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست۔ بہرحال آپ میرے اسی طرح سے عزیز از جان ہیں جیسے کامران، عرفان اور عدنان۔ آپ میرے لکھے ہوئے ٹوٹے پھوٹے اور بے جوڑ سے لفظوں کو تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں، یہ بھی آپ کی اعلیٰ نسبی اور خوب تر خاندانی پس منظر کی علامت ہے۔ ورنہ

من آنم کہ من دانم

زندگی میں ایسا موڑ بھی آتا ہے جب تنہائی عفریت بن کر انسان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ یہ وہ موقعہ ہوتا ہے جب آل اولاد اپنی اپنی دنیاؤں میں کھو جاتی ہے، بوڑھا تنگ و تاز حیات کے بعض تقاضوں سے عہدہ برآ ہو چکتا ہے۔ زیست کا اک دریا جھاگ، کر جب وہ کنارے پر پہنچتا ہے تو اس کے قویٰ مضمحل اور اعصاب کمزور ہو چکے ہوتے ہیں۔ یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب وہ اک ساعت کیلئے پیچھے مڑ کر دریا کی چھلوں پر اک

Marfat.com

نظر ڈالتا ہے۔ اک آسودہ سی انگڑائی لیتا ہے اور شیکسپئر کے کردار کا آخری ایکٹ کھیلنے کیلئے سٹیج کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ اُس کے دنیاوی کردار کا یہ حصہ اک المیہ ہے یعنی تنہائی کا احساس۔ جن دیئوں اور چراغوں کو اس نے روشنی عطا کی ہوتی ہے، وہ فطرت کے عین مطابق اپنی توانا روشنی سے مستقبل کے چراغ روشن کرنے کی جدوجہد میں جُت چکے ہوتے ہیں۔ پھر اُس سے کوئی یہ کہانی سننے کا روادار نہیں ہوتا کہ باباجی یہ کڑے کوسوں کا سفر کیسے طے کیا۔ اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کوئی اُس کے قریب بیٹھے اور اس کی گذری زندگی کے سنگ ہائے میل اور یادوں کے مدھم ہوتے خوابوں کے احوال سنے۔ تنہائی کی یہ گھمبیرتا ایک تھکے ماندے ریٹائرڈ شخص کیلئے اس وقت دوچند ہو جاتی ہے جب وہ کسی بڑے اور اجنبی شہر کو اپنے آخری ایام کا ٹھکانہ بنالیتا ہے۔ کیونکہ بڑے شہروں میں نفسا نفسی کا عجیب عالم ہوتا ہے۔ آپ صبح سویرے کسی مصروف روڈ کے کنارے کھڑے ہو کر مشاہدہ کریں آپ کو بلا تخصیص سن و سال اور بلا تمیز جنس و ذوق انسانوں کا اک متحرک اور پریشان جم غفیر ہلکورے کھاتا ہوا نظر آئے گا۔ ہر نفس دوڑتا بھاگتا اور پکڑ یو بھاگیو کی ہیجانی کیفیت میں ملے گا۔ اک چھوٹا سا حشر بپا ہوتا ہے جس میں نفسی نفسی کی آوازیں ہوتی ہیں اور پھر یہی منظر دفاتر ٹوٹنے کے وقت ہوتا ہے۔ رات کے دو بجے ہیں۔ وہ صاحب فراش شخص سونا چاہتا ہے مگر ابھی تک ٹیکسیوں، رکشوں اور گاڑیوں کی آوازیں یم بہ یم اور دھما دھم موجود ہیں۔ اور نزدیک کی مسجد کے سر بفلک ٹکے ہوئے لاؤڈ سپیکر گونج رہے ہیں، دھاڑ رہے ہیں، سیرت کانفرنس ہو رہی ہے۔ نعرۂ رسالت اور اگر کمزور سا یا رُسول اللہ آئے تو سامعین پر منبر سے تبریٰ آتا ہے اور اُن کے ایمان کے ضعیف ہونے کی وعید سنا دی جاتی ہے۔ وہ بوڑھا کہتا۔

میں وحشی بھلا مجھ کو میرے صحرا میں پہنچا دو
کہ میں پابند آدابِ گلستاں ہو نہیں سکتا

Marfat.com

یہی وجہ لمحہ ہوتا ہے جب Nostalgia پے در پے بوڑھی جان پر حملے شروع کر دیتا ہے۔ پھر یہاں فطرتوں کی مختلف Offshoots آجاتی ہیں۔ کسی کو چکا چوند روشنیاں، رونق میلے اور شور وشغف راس آجاتا ہے اور کوئی پراگندہ طبع مزید اتھا اکلاپے کا شکار ہو کر اپنے اندر جا پناہ ڈھونڈتا ہے...... میرے جیسا فقیر آدمی کہ ہل پنجالی، پٹھا کترہ اور گھی مکھن کی سہانی یادیں جس کے نہاں خانۂ دل میں ابھی تک انگڑائیاں لیتی ہوں، اس شہر ناپرساں میں صرف موت کا انتظار کر سکتا ہے۔ صرف خوشی ہے تو یہ کہ بچے اس شہر کے انتخاب پر خوش ہیں۔ چڑیا کا بوٹ جب آلنے سے باہر کی آزاد فضاؤں میں آڑان لیتا ہے تو قدم قدم ٹھوکریں اور لحظہ لحظہ موت کے خوف سے وہ بے خبر ہوتا ہے مگر اُس کے ماں باپ کا اضطرات دیدنی ہوتا ہے کہ ہر خطرے سے نمٹنے کیلئے وہ اُس پر ہاتھوں کی چھاؤں کیے ہوتے ہیں۔ میں بھی ان تجربات سے گذر رہا ہوں۔ بلکہ کچھ منزلیں آگے نکل آیا ہوں۔ مگر ماں باپ کیلئے تو بوٹ بوٹ ہی رہتا ہے۔

تھی جتنی روشنی وہ تجھے دے چکا ہوں میں
اب خود بھی جلنا سیکھ کے بجھنے لگا ہوں میں

نہ جانے میں کیا کہنا چاہتا تھا اور بات میرے ہاتھ سے دائیں بائیں پھیل رہی ہے۔ کافی عرصہ سے میں کوئی قابل ذکر تخلیقی کام نہیں کر سکا۔ کیونکہ مجھ پر اب وہی دور گذر رہا ہے جہاں جی چاہتا ہے کہ کوئی باتیں کرنے والا ملے۔ شائد یہی وجہ ہے کہ کوئی ادبی کام کرنے کی بجائے اب میرا جی کرتا ہے کہ خط میرے نام آئیں۔ میں پڑھوں اور پھر جواب لکھوں۔ بیچارہ ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی بھی میرے جیسے عارضے میں مبتلا ہے اور ڈاکیے کے انتظار میں قشقہ کھینچتا رہتا ہے۔ بس وہی بات ہے کہ ہمارے پاس بیٹھ کر ہم سے بات کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

آج کل سردیاں ہیں۔ میں روشنی بجھا کر اپنی رضائی کی گرمائیوں میں آنکھیں

Marfat.com

بند کر لیتا ہوں۔ اور پھر پردۂ سیمیں پر فلم چلنے لگ جاتی ہے۔ اور میں کھو جاتا ہوں۔

چلو پھر ڈھونڈ لائیں ہم اُسی معصوم بچپن کو
انہی معصوم خوشیوں کو، انہی رنگین لمحوں کو
جہاں غم کا پتہ نہ تھا، جہاں دکھ کی سمجھ نہ تھی
جہاں بس مسکراہٹ تھی، بہاریں ہی بہاریں تھیں
کہ جب ساون برستا تھا تو پھر کاغذ کی کشتی کو
بنانا اور ڈبو دینا بہت اچھا سا لگتا تھا
اور اس دنیا کا ہر چہرہ بہت سچا سا لگتا تھا
چلو پھر ڈھونڈ لائیں ہم اُسی معصوم بچپن کو

یہیں تک لکھا تھا کہ آپ کا فون آ گیا...... خلاف عادت اور خلافِ مزاج میں بہت بولا ہوں اور آپ سے بہت سے باتیں کر ڈالی ہیں۔ اپنی زیادہ سنائی ہے اور آپ کو بولنے کا موقعہ بہت کم دیا ہے۔ فون بند ہوا تو مجھے شرمندگی نے آ گھیرا کہ یہ میں نے کیا کیا کہ بچے نے مجھے فون کیا اور میں نے اُسے پوری رام لیلا پڑھ کر سنا دی۔ یہ کیسے ہوا۔ معلوم نہیں، شائد خط کے اسی رنگ میں ٹیلیفون کی گفتگو بھی رنگی گئی۔ بے ربط اور بے سمت بسیار گوئی۔ اللہ جی آپ کو ہمیشہ اپنے حفظ وامان میں رکھے۔

آپ کا چچا (انکل)

Marfat.com

تخلیل کے کرشمے ہیں

کل شام میں اپنے لان میں بیٹھا مظاہراتِ قدرت کا مشاہدہ کرر ہا تھا۔ زمین سے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھیں تو مختلف پرندوں کے غول اور جوڑے دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں جاتے نظر آئے۔ اچھے اور خاندانی پرندے سنجیدگی سے محو پرواز تھے۔ کوے قسم کی مخلوق شور شرابے اور ہاؤ ہو میں مصروف تھی۔ مغنی اور سازندے قسم کے پرندے اپنی ''میریانہ'' ادا میں مصرف تھے میرا طائر خیال پھر سے اڑ گیا۔ دیو پریوں کو پر عطا کیے گئے اور ان پروں نے ان کے بہت سارے مسائل حل کر دیئے جب کسی جی میں اغوا کی واردات کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اسے کسی مجرمانہ منصوبہ بندی کی ضرورت نہیں پڑتی کسی کلاشنکوف اور بے نمبری کار کا تردد نہیں کرنا پڑتا کسی سہانی شام وہ محو پرواز ہوتا ہے۔ پوری دنیا کا ایک چکر لگاتا ہے۔ اور جہاں کہیں اسے کسی بادشاہ کا اکلوتا، خوب صورت اور نازوں میں پلا بیٹا (شہزادہ) محوِ خواب نظر آتا ہے۔ اسے مسہری کے ساتھ اٹھا کر لے جاتا ہے۔ بعد میں بادشاہ بھلا اپنی آدھی سلطنت بیٹے کی بازیابی میں دیتا پھرے۔ انسانوں کے اغوا کیے ہوئے انسان کبھی نہیں لوٹے تو کوہ قاف میں قید کیا ہوا شہزادہ بھلا کیسے واپس آ سکتا ہے پریاں بھی دل رکھتی ہیں۔ ان کی واردات کو اغوا کا سخت گیر نام تو نہیں دیا جا سکتا بہر حال اس حرکت کو آپ عاشق ہو جانا ہی کہتے ہیں۔ پری کسی شہزادے پر عاشق ہوئی تو سمجھئے، شہزادے کا تعلق دنیا سے کٹ گیا۔ اغوا کے معروف طریقے کے مطابق پری اپنے معشوق شہزادے کو کوہ قاف جیسے علاقہ غیر میں لے جاتی ہے مگر اس سے آگے رومان کا وہ سفر شروع ہو جاتا ہے جس کے روک تھام کے لئے آدم زاد

Marfat.com

پر حدود آرڈیننس لاگو ہوتا ہے کنیزیں شہزادے کو عطر پھلیل سے نہلاتی ہیں۔ انواع واقسام کے معکولات ومشروبات سے مغوی کی خاطر تواضع کی جاتی ہے۔ شہزادہ اپنے اردگرد پریوں کے اتنے غول دیکھ کر بے اعتباری میں ابھی اپنی آنکھیں مل رہا ہوتا ہے کہ اغواء کنندہ اپنے تمام تر جلوں کے ساتھ نمودار ہوتی ہے بذریعہ تالی تمام کنیزوں کو تخلیے کا حکم ملتا ہے اور پھر......

پرندے بھی کس قدر خوش قسمت ہیں اپنی مرضی سے چہچہاتے اپنی مرضی سے اڑتے ہیں۔ درختوں کی ہری بھری ڈالیوں پر خوب صورت آشیانے بناتے ہیں۔ نہ پلاٹ کے پیچھے بھاگ دوڑ۔ نہ راج مستریوں کی منتیں اور نہ گارا مٹی کی فکر، جہاں جی چاہا، جتنی بلندی پر طبیعت آئی ایک آشیانہ بنالیا اور پھر اس میں بیٹھ کر محبت ومہر کے گیت گائے بھوک لگی تو خدا کی وسیع زمین پر مسبب الاسباب کی ذات کا یقین کر کے اڑان لی اور اپنے عقیدے اور ایمان کی بنیاد پر اپنے حصے کا دانا دنکا وصول کر کے پیٹ بھر لیا اور پھر کی فکر اس مالک پر چھوڑ کر خالی ہاتھ اپنے آشیانے پر واپس آ گئے۔ نہ ذخیرہ اندوزی کا خیال نہ دوسروں کے پیٹ پر چھری مار کر اپنے دوزخ کو ضرورت سے زیادہ بھرنے کی لالچ...... صبح کا وہ وقت جب خدا کا نائب ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں خواب غفلت کے مزے لے رہا ہوتا ہے۔ خدا کی یہ شاکر ومطمئن مخلوق حمد وثنائے رب جلیل میں مصروف رہتی ہے آج تک کسی پرندے نے رزق کی فراوانی کا لالچ نہیں کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ شاید آج تک کوئی پرندہ بھوک سے نہیں مرا۔ پرندوں کے بارے میں یہ سوچتے سوچتے میرا طائر خیال بھٹک کر انسانوں کی دنیا میں چلا آیا۔ اگر انسانوں کو پر لگ گئے ہوتے تو کیا ہوتا۔ جب تک پرندوں کی زندگی پر میرے تصورات کی فلم چلتی رہی تو میں معصومیت محبت اور ملاحت کی خوشبو اپنے بدن کے آس پاس محسوس کرتا رہا۔ لیکن جونہی انسانوں کی دنیا پر میری نظر پڑی تو چشم تصور تمام تر مادیت سے آراستہ ہوگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اسلام آباد کا ابھرا جدید

Marfat.com

ترین شہر سرسبز وادی خوشنما پہاڑیوں اور دور دور تک خاموشی میں بسا ہوا ملا۔ نہ سو سو گز کے گھر نہ ڈربہ نما فلیٹ، نہ وسیع و عریض کوٹھیاں اور جدید ترین محل۔ بس ہرے بھرے درخت اور ان درختوں پر انسانوں کے گھونسلے چشم تصور نے دیکھا کہ جب پلاٹ کی طلب ہی نہ رہی تو اسلام آباد میں بسنے والوں کی نیتیں کس قدر صاف ہوگئی ہیں ان کے لب ولہجہ میں کس قدر میٹھاس آ گئی جو کہ بے غرض ہے۔ میں چشم تصور میں اسلام آباد کی نئی صورت حال پر غور کر رہا تھا۔ کہ اختر امان کا خیال آ گیا۔ میرا یہ غمخوار دوست بھی تو اسلام آباد میں رہتا ہے۔ درختوں کے اس جھنڈ میں اس کا آشیانہ کس طرح تلاش کرنا ممکن ہوگا۔ میں نے دیکھا کہ اگر انسان پروں والا ہوتا تو قومی خزانہ کو صرف ایک مد میں کتنی بحت ہوتی۔ اور دس روپے بستر کے حساب سے مریضوں پر ٹیکس لگنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ سواری کے تمام مسئلے حل ہو جاتے۔ ارباب بست وکشاد وزیروں مشیروں کے لئے "ہٹو بچو" کا شور پیدا کرنے کے لئے کروڑوں روپے ہر سال خرچ ہوتے ہیں زیادہ اہم لوگوں کے لئے پرواز کرنے کی مشینری منگوائی جاتی ہے۔ پھر ان مشینوں کے آگے پیچھے "ہٹو بچو" کے نعرے لگانیوالی مشینری کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر ان مشینوں کو چلانے کے لئے غیر اہم افرادی قوت کو ملازم رکھا جاتا ہے۔ اگر ایک بریف کیس ہاتھ میں ہو اور کسی ملک کا وزیراعظم پرواز کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جائے تو کیسا خیال ہے۔ کتنی بچت ہوتی۔ نہ جہاز نہ ہیلی کاپٹر نہ استقبال کے لئے آنے والے سکولوں کے پیاسے بھوکے بچے جھنڈیاں ہلانے والے، دنیا جنت نہ بن جائے، سواری الاؤنس کا جھنجھٹ ہی ختم ہو جاتا۔ زندگی کس قدر پرسکون ہو جاتی موٹروں ریل گاڑیوں اور ہوائی جہازوں کا شور وشغف، ایک روح پرور سکون میں تبدیل ہو جاتا۔

عیدیں آتیں تو بھاگیو، دوڑیو، اور سواری پکڑیو کی تکلیف نہ ہوتی۔ کسی محکمے کا سیکرٹری اپنی بیوی اور دو بچوں کے ہمراہ محو پرواز ہوتا تو اسی محکمے کا نائب قاصد کرم دین بھی

Marfat.com

اپنی بکسی اپنے کندھے پر رکھے اپنے سات بچوں اور بیوی کے ہمراہ بلکسر تحصیل چکوال کو پرواز کر جاتا۔ نہ بسیں، نہ حادثے نہ بم ہوتے۔

سوچتے سوچتے میرے دل میں اک ہوک سی اٹھی۔ کاش میں پرندہ ہوتا۔ لوگوں میں محبتیں تقسیم کرنے والا پرندہ اپنی مرضی سے کسی کو چاہنے والا پرندہ۔ کاش مجھے یہ ایمان عطا ہوتا کہ اب پیٹ بھر کر کھالو۔ کاش میری احتیاجات بھی فاختہ جیسی مختصر اور بے نام ہوتیں۔ کاش مجھے کسی کار اور بینک بیلنس کا دماغ نہ ہوتا۔ کاش میرے ذہن میں جائز یا ناجائز طریقے سے دوسرے کی جیب کاٹ کر اپنی جیب بھرنے کا گھٹیا پن نہ ہوتا۔ کاش مجھے یہ فکر لاحق نہ ہوتی کہ اگر میں کل مر گیا تو میری اولاد کا کیا بنے گا کاش میں اونچی فضاؤں میں پرواز کرنے والا وہ پرندہ ہوتا۔ جس کی نگاہ اونچی ہوتی ہے ذہنیت اونچی ہوتی ہے طبیعت فرشتے کی طرح سادہ اور پاک باز ہوتی ہے۔ اے کاش اگر ایسا ہوتا تو خدا کی خدائی میں کیا فرق پڑ جاتا۔ میرا طائر خیال چھپاک سے پھر اسی مادی دنیا میں اس لمحے واپس آ گیا۔ جب میرا نوکر ہاتھ میں چائے کا پیالہ لیئے بڑے مودب لہجے میں مخاطب ہوا۔ صاحب جی! چائے، جھٹپٹا ہو چلا تھا۔ اور پرندے واپس خوش خوش اپنے بسیروں کو لوٹ رہے تھے بے بسی کے دو گرم گرم آنسو میرے گالوں پر بہہ نکلے۔

Marfat.com

ملتان پر ایک حساس مضمون

ملتان مجھ سے چھوٹ رہا ہے۔ جدائی کے روائتی کلمات سے قطع نظر مجھے جدائی کے ان لمحات اور بچھڑتی گھڑیوں کو اظہار کا لبادہ پہنانے کے لئے الفاظ نہیں مل رہے۔ بہت کوشش کرتا ہوں کہ اپنے احساس کی آنکھ بند کر لوں محبتوں، شفقتوں، مہربانیوں اور دوستیوں کے بیتے ہوئے وقت کی دل چیر دینے والی یادوں کو خواب آور گولیاں کھلا کر مدہوش کر دوں لیکن دنیاداری اسی چیز کا نام ہے۔ کہ انسان بہت کچھ کرنا چاہے مگر بہت کچھ اس کے بس میں نہ ہو ملتان کیا چھوٹ رہا ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ میرا جی مجھ سے چھوٹ رہا ہے۔ جی چھوٹنے کی اس کیفیت سے میں دوسری بار دو چار ہو رہا ہوں۔ پہلی دفعہ یہ کیفیت مجھ پر اس وقت طاری ہوئی تھی جب میں چھوٹا سا تھا اور میری سب سے بڑی پیاری بہن کی شادی ہو رہی تھی سب مجھے کہتے تھے کہ تمہاری باجی پرائی ہو جائے گی۔ اور مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ شاید لوگ مجھ سے پیار میں مذاق کر رہے ہیں۔ لیکن شادی کے دن جوں جوں قریب رہے تھے۔ میری بہن کی محبت مجھ سے بڑھ گئی اور وہ اکثر مجھے گلے لگا کر رویا کرتی تھی۔ میں ساکت و ساکن حیران سا رہ جاتا تھا۔ لیکن مجھے یوں لگتا تھا گویا میرے دل میں کوئی پنجہ گاڑھ کر اسے میرے اندر سے نکال رہا ہوں۔ اس کیفیت کو میں اس وقت بھی کوئی صحیح نام نہیں دے سکتا تھا۔ کہ میں بچہ تھا اور آج جب ملتان سے بچھڑ رہا ہوں تو بھی اپنے پہ طاری ہونے والی اس کیفیت کو کوئی نام نہیں دے سکتا۔ کہ مجھ میں اظہار کی کمی ہے یہ کمی کئی نازک موقعوں پر میرے لئے عذاب جان بنتی رہی ہے۔ آج ملتان میرے بچپن کی طرح مجھے ششدر و حیران سا لگتا ہے اور مجھے اپنا کر دار اس پیار

Marfat.com

کرنے والی بہن کا سا، جو مجھے بچھڑتے لمحوں میں گلے لگا کر دھاڑیں مار مار کر روتی رہی تھی۔ بچپن کے ان نازک لمحوں میں میں سوچتا تھا کہ یہ بہن چلی گئی تو پھر کیسا جینا؟ مجھے کون نہلائے گا۔کون کپڑے پہنائے گا۔کون جھولے جھلائے گا،کون کھلائے پلائے گا، اور رات کو سوتے ہوئے شہزادی مہر النساء والی کہانی کون سنائے گا؟ میں چھوٹا تھا اور میرا شعور نا پختہ، گھر کے دوسرے لوگوں کے پیار نے میرے احساس کی خلیج کو پاٹ دیا لیکن میری ملتان سے محبت میرے پختہ زمانے کی کہانی ہے اور اس سے بچھڑنا بھی میرے پختہ شعور کے دانا و بینا وقت کا المیہ ہے۔ملتان سے بچھڑنے کے بعد کی زندگی کا تصور کرتا ہوں تو کوئی پنجہ میرے دل کی طرف بڑھتا ہے اور پھر دل کو وجود سے نکال لینے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ابتداء میں ادھر اُدھر سے یہ شور میں سنتا رہا کہ میں ملتان سے بچھڑ رہا ہوں۔لیکن اپنے بچپن کی طرح میں نے اس شور پر یقین نہ کیا۔پھر وہ وقت آیا جب لمبے لمبے ملتان کی مٹی کو چومنے کے جذبوں نے میرے اندر جنم لیا۔تو مجھے یقین ہو چلا کہ بچھڑنے کی گھڑی آ گئی ہے۔آج میں ملتان کو رو رو کر اپنے گلے لگاتا ہوں۔اور ملتان ششدر و حیران میرے چہرے کو تکے جاتا ہے۔مجھے آج کل فانیؔ کا وہ شعر بہت ستاتا ہے۔

فانیؔ ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

شمیم ترمذی نے اپنے مٹیالے مضمون میں ملتان سے وابستگی کا سلسلہ اپنے غیر شعوری عہد سے شروع کیا ہے وہ ملتان کی محبت کو تو لفظ عطا کر سکتا ہے۔لیکن اس کے پاس ملتان کی محبت ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے وہ اپنے ماضی میں ملتان میں رہا ہے۔اور اس کا حال ملتان میں گذر رہا ہے اور مستقبل بھی یقیناً ملتان سے وابستہ ہے۔وہ بچپن میں یہاں آیا اور آج تک اس شہر کی شفقتوں کے مزے لوٹ رہا ہے۔اُسے کیا پتہ کہ جدائی کا عمل کتنا کربناک ہوتا ہے۔میں پختہ شعور لے کر اس شہر کی پناہوں میں داخل ہوا۔مجھے میرا

Marfat.com

یوٹو پیا میسر آیا۔ تو میرے قہقہوں میں کھنک پیدا ہوئی۔ میرے چند ذاتی حادثے بھی میرے قہقہوں کی کھنک میں دم گھٹ کر مر گئے۔ مجھے قدم قدم پر خلوص کے گھنے اور سایہ دار درخت نصیب ہوئے اور میں ایک بات کو بھول بیٹھا کہ میں ایک مسافر ہوں اور ملتان میرے راستے میں پڑنے والی بستی ہے۔ جہاں پر چند لمحوں کے قیام اور زادِ راہ کے حصول کے بعد مجھے آگے جانا ہوگا۔ ذہن کی شعوری کیفیت کے ساتھ میں ملتان میں داخل ہوا اور اسی پختہ شعور کی حالت میں شہر سے باہر نکل رہا ہوں۔ میری محبت شدید اور میرا شعور پختہ۔ مٹیالے مضمون کا خالق مجھ پر گذرنے والی قیامت کا شائد اندازہ بھی نہ کر سکتا ہو کیونکہ اس کے پاس محبت کو ناپنے کا پیمانہ نہیں ہے ملتان کے چار سال میری ذہنی وابستگی اور تکمیلِ محبت کے آخری لمحوں کی کہانی ہے۔ میں نے شہر دیکھے ہیں شہروں کا ویب اور چال چلن دیکھا ہے میرے پاس ملتان اور ملتانیوں کی محبت، مہر وفا، شائستگی و شستگی اور اپنا بنا لینے کی صلاحیتوں کو پرکھنے اور ناپنے کے لئے ایک واضح کسوٹی موجود ہے۔

میں اپنی گٹھڑی کندھے پر رکھے ایک آنے والے سفر کی صعوبتوں کا سامنا کرنے کے لئے تیار کھڑا ہوں۔ میرے آگے ناآشنا راہوں کے سنگلاخ فاصلے ہیں۔ اجنبیت کی چلچلاتی دھوپ ہے اور احساس تنہائی کا لق و دق صحرا ہے بچپن کی طرح میرا ذہن یہ سوچنے لگ جاتا ہے کہ اس کے بعد جینا بھی بھلا کیسا جینا؟ اے بی اشرف، انوار اور مجو کہ نہیں ہوں گے تو میں کہاں گھوموں پھروں گا۔ کس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں میں مرغ پیس کی دعوتیں اڑاؤں گا۔ میرے ٹوٹتے پھوٹتے حالات میں انوار احمد کی طرح کون آکر مجھے تسلیاں دے گا۔ اور میری دلجمعی کرے گا۔ رؤف شیخ نہیں ہوگا تو چہلیں کس سے چلیں گی۔ وہاں کاٹ دار جملوں سے محفل کو زعفران زار بنانے کے لئے انوار اور آذر نہیں ملیں گے۔ آذر جیسا خوب صورت دل و دماغ اور مترنم آواز رکھنے والا شخص بھلا اس سنگلاخ شہر میں کہاں سے آئے گا۔ امین کی ہائیکو

Marfat.com

کون سنائے گا۔ وہاں کوئی عرش صدیقی نہیں ملے گا۔ جس کی طرف اشارہ کر کے میں ذہین، متحیر آنکھ کا نمونہ دکھا سکوں وہاں کوئی ساغر صدیقی بھی نہیں ہوگا۔ جو اپنے اوپر لکھے گئے طنزیہ اور مزاحیہ کالموں کو ایک لفظ ادھر اُدھر کئے بغیر شائع کر کے اپنی صحافیانہ عظمت کا لوہا منوا سکے۔ مجھے وہاں مقصود زاہدی، عاصی کرنالی، ارشد ملتانی، حزیں صدیقی اصغر علی شاہ کی شفقتیں اور محبتیں بہت یاد آئیں گی۔ میرا یقیناً دم گھٹنے لگے گا اس گھٹن کا میرے پاس کیا علاج ہوگا؟ ملتان جب نیا نیا وارد ہوا تھا تو میں بالکل تنہا تھا۔ ان دنوں بھی میرا دم گھٹتا تھا۔ لیکن قلعہ کہنہ قسم باغ کی اونچائیوں نے ہمیشہ مجھے اپنی گود میں لے کر میری دلجوئی کی۔ میرے آنسو پونچھے اور ایک چھوٹے بچے کی طرح دمدمے سے ابھرنے والے ملتان کے نقش و نگار کا کھلونا میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ دمدمے پر میں اکثر شام کی ملگجی روشنی میں پہنچ جایا کرتا تھا۔ پھر میری چشم تصور بکھرے ہوئے ملتان شہر کی قدیم فضاؤں پر تاریخ کے پارینہ اوراق کو پھیلتے، بکھرتے اور ٹھہری ہوئی ہوا میں ہلکورے کھاتے ہوئے محسوس کرتی۔ جنگجوؤں کے قافلے میری نظر کے سامنے سے گذرتے چلے جاتے۔ تاریخ کا یہ سلسلہ کچھ اس طرح چل نکلتا کہ میری گھٹن کا تریاق بن جاتا۔ رات ڈھلتی تو میں اپنے ٹھکانے پر واپس آجاتا۔ لیکن میں جہاں جا رہا ہوں۔ وہاں میری گھٹن کا کوئی تریاق نہیں ہوگا۔ کوئی میرے اندر کی ٹوٹ پھوٹ میں جھانک کر میری دلجمعی نہیں کرے گا۔

ایک مہینہ ہونے کو آیا ہے میں بے اعتباری کی عجیب کیفیت سے دوچار ہوں۔ اپنے گھر کے اندر رہوں تو جی چاہتا ہے کہ کمرے میں مقید رہوں باہر نکلتا ہوں تو اپنے اردگرد کی چیزوں کو دیکھ کر چھوڑ جانے کا خیال آتا ہے اور چھوڑ جانے کا یہ خیال جان کاہ بن جاتا ہے۔ اپنے دوستوں کے مانوس چہروں کو دیکھتا ہوں تو یہ چہرے آہستہ آہستہ آنکھ کے پانی میں تحلیل ہو جاتے ہیں مجھے ناصر کاظمی کی یہ بات بہت یاد آتی ہے۔

Marfat.com

جب اگلے سال یہی وقت آرہا ہوگا
یہ کون جانتا ہے کون کس جگہ ہو گا
بچھڑنے والے تجھ دیکھ دیکھ سوچتا ہوں
تو پھر ملے تو کتنا بدل چکا ہو گا

ملتان میرا وطن نہیں کہ میں کہوں اس کی فضاؤں نے لوریاں دے دے کر مجھے جوان کیا۔ مجھے پہل پہل ملتان جانے کا حکم ملا۔ تو میں نے بڑی بددلی سے تعمیل کی لیکن یہاں آیا تو میری اپنی تکمیل ہوئی مجھے ملتان نے اپنے ہونے کا احساس کی دولت عطا کی۔ ہونے کے اس احساس تک چل کر جانے کے لئے میرے دوستوں نے مجھے بیساکھیاں پکڑنے کا سلیقہ سکھایا۔ میں بیس سال سے لکھ رہا تھا۔ مگر مجھے قلم پکڑنا نہیں آتا تھا۔ میری زندگی چند سماجی المیوں سے عبارت ہے۔ اگر یہ ملتانی نہ ہوتے تو ان المیوں میں مایوسیوں اور بددلی کے مزید سیاہ رنگ بھرتے چلے جاتے۔ ملتان اور ملتان والوں نے مجھے یہ اصول سمجھایا کہ زندگی غم سے عبارت ہے۔ اس غم کو بھلانے کا تعمیری طریقہ یہ ہے کہ ہنسو، مسکراؤ اور غم کو قہقہوں کی کھنکار سے مدہوش کر دو۔ میرے دانشور اور اہل قلم دوست میری مجبوریوں کا احساس کر کے اپنے ذہنی رتبے سے نیچے اتر کر مجھے اپنے ساتھ ساتھ چلانے کے لئے مختلف زاویوں سے میرے حوصلے بڑھاتے رہے۔ اور میں بلند سے بلند تر ذہنی سفر طے کرتا رہا۔ سوچتا ہوں کس کس بات کو لکھوں اور کس کس طرح سے لکھوں میرے اردگرد اتنے محسن چہرے اکٹھے تھے کہ تذکرہ کرانے بیٹھوں تو کبھی جی نہ بھر پائے میں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ لاہور میں گذارہ ہے۔ وہاں بھی میرا اپنا حلقہ تھا۔ لیکن عجیب نفسا نفسی تھی۔ ہم لوگ محض وقت کاٹنے کے لئے مل بیٹھتے تھے ہمیں ایک دوسرے کے درد کا کوئی احساس نہیں ہوتا تھا۔ بارہ سال کا ایک طویل عرصہ ان لوگوں میں گذار کے اچانک ایک اندھیری رات ٹرین پر سوار ہو کر میں وہاں سے چل دیا۔ نہ انہیں میری کمی محسوس ہوئی

Marfat.com

اور نہ وہ محفل چھوٹ جانے پر میں مضطرب یا پریشان ہوا۔ لیکن ملتان نے چاہتوں اور محبتوں سے میرا دامن اس طرح بھرا کہ کبھی کبھی مجھے اس صورت حال پر کسی سازش کا شک سا گذرنے لگتا ہے مجھے ارشد ملتانی کا یہ کہنا ایک سچ لگتا ہے۔

ڈھونڈنے سے بھی نہ پاؤ گے ارشد جہان میں
خوئے وفا و مہر جو ملتانیوں میں ہے

Marfat.com

سادھو درویش

یہ آج سے چالیس اکتالیس سال پہلے کی بات ہے جب میں کالج کا طالبعلم تھا۔موسم سرما اپنے جوبن پر تھا۔میں ایک مباحثے میں شرکت کرنے کیلئے ملتان جانے کی خاطر رات بارہ بجے ریلوے اسٹیشن پہنچا۔لیہ سے رات کو ایک ٹرین گذرتی تھی جو صبح سویرے ملتان پہنچ جاتی تھی۔میرا دوسرا ساتھی بھی پہنچ چکا تھا۔معلوم ہوا کہ گاڑی دو گھنٹے لیٹ ہے۔ہم انتظار گاہ میں جا بیٹھے جہاں ہماری طرح کئی دوسرے مسافر بھی موجود تھے۔چونکہ سردی تھی اس لئے لوگ چادروں، لگاروں اور کمبلوں میں ڈ بکے ہوئے تھے۔ کچھ مسافر لمبی تانے کرسی نما کوچوں میں سو رہے تھے۔ہم نے تعلیم کے حوالے سے بات چیت شروع کر دی۔دوسرے تعلیمی اداروں کا تقابل بھی تذکرے میں آیا۔کچھ دیر بعد ہمارے قریب ایک کرسی میں حرکت سی ہوئی۔اندر اندھیرا تھا۔کمبل ہٹا اور ایک جوان شخص نے ہم سے استفسار کیا کہ کیا ہم گورنمنٹ کالج لیہ کے طالب علم ہیں۔مثبت جواب ملنے پر مذکورہ شخص نے اپنا تعارف کرایا "میں خیال امروہوی ہوں اور آپ کے کالج میں فارسی کا لیکچرار بن کر آیا ہوں"۔یہ عبقریٔ وقت نابغۂ روزگار اور جغادری دانشور ڈاکٹر خیال امروہوی سے میرا پہلا تعارف تھا۔اس سے پہلے میں خیال امروہوی کو ڈیرہ اسمٰعیل خان کے ٹیٹلر سینما میں ایک مشاعرے میں سن چکا تھا۔اور میرے جوان ہوتے ہوئے ذوقِ شعر کے کسی کونے میں ان کا شعری تفکر گہرے اثرات مرتب کر گیا تھا۔

بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے گذر چکا۔اگر چہ یادوں سے دھول جھڑتی ہے تو کئی چہرے نکھرنے لگتے ہیں لیکن واقعات کا تسلسل پھر بھی دھندلایا سا رہتا ہے۔

Marfat.com

66-67ء کا وہ عرصہ میرے سامنے دست بستہ کھڑا ہے۔ جب امروہوی صاحب نئے نئے لیہ میں آئے تھے اور یہ عرصہ میرے شہر میں قیام کیے آخری ایام کا عرصہ تھا۔ کیونکہ حصول علم کیلئے مجھے شہر سے باہر جانا تھا۔ لیہ میں صرف انٹرمیڈیٹ کالج تھا۔ یہ کالج شہر میں ریلوے روڈ پر واقع امام باڑہ کے بالکل سامنے والی پرانی عمارت میں تھا۔ آجکل وہاں ہائی سکول ہے۔ میرے زمانے میں یہ سکول اسی عمارت کی ایک بغلی بلڈنگ میں ہوتا تھا۔ یہ سکول کسی مخیّر ہندو نے بنایا تھا۔ پہلے اسے ایم بی ہائی سکول کہا جاتا تھا۔ پھر کسی صاحب اقتدار کے اندر انسانیت نے جوش مارا اور اس کے بانی کے نام پر دوبارہ اسے ایم بی بھراتری ہائی سکول کہا جانے لگا۔ پھر ایم سی ہائی بنا اور آجکل شائد یہی نام ہے۔ ڈاکٹر خیال امروہوی کے ساتھ جڑے تعلق سے اور کتنی یادیں وابستہ ہیں۔

کیا کیا ہمیں یاد آیا جب یاد تری آئی

میں اُن دنوں فکری مسافرت میں تھا۔ مذہبی ذہن ہونے کے باوجود تشکیک و تجسس کا اک لامتناہی سلسلہ تھا جو میرے اندر کلبلا رہا تھا۔ افکارِ مودودی کو ازبر کر لینے کے باوجود مجھے اپنے سوالات کے جواب نہیں مل رہے تھے۔ میں نے کارل مارکس اور ہیگل کو پڑھا۔ پھر ''موسیٰ سے کارل مارکس تک'' کا مطالعہ کیا۔ ''ماضی کے مزار'' بھی دیکھ لی۔ خیال براہِ راست میرے اُستاد نہیں تھے لہٰذا درس وتدریس کے حوالے سے میرا اُن سے کوئی علاقہ نہیں تھا لیکن میں ایسا کوئی موقع ضائع نہیں کرتا تھا جب اُن کے خیالات سے استفادہ کرنے کی سبیل نکل رہی ہوتی۔ اگرچہ میرا مطالعہ کچھ زیادہ نہیں تھا اور ذہن بھی ناپختہ تھا مگر اُن کی گفتگو میں انسانیت کا جو درد موجزن تھا، میں اسے بھلا نہیں سکا۔ اپنی طالبعلمانہ زندگی میں ڈاکٹر خیال امروہوی کی صورت میں میں نے پہلا ترقی پسند، انسانیت پرست اور کمیٹڈ انسان دیکھا۔ انہی دنوں اک نوجوان نے کالج سے متصل فوٹوگرافی کی دکان کھولی۔ لیہ جیسے شہر میں وہ پہلا پڑھا لکھا، سوٹڈ بوٹڈ فوٹوگرافر تھا، خاموش

Marfat.com

طبع مگر ذہین وفطین آنکھوں والا ظفر زیدی خدا جانے وہ کہاں سے آیا تھا۔ مگر فکر وخیال کے اعتبار سے بڑا پکا کمیونسٹ۔ وہ نہ صرف خیال صاحب کا دوست تھا بلکہ میری بھی اُس سے ماچھی خاصی نشست رہنے لگی۔ پھر چشم فلک نے وہ منظر بھی دیکھا جب زیدی نے خیال کی اک تصویر کیا خراب کی۔ کورٹ کچہریوں تک اک دوسرے کو دھمکیاں دی گئیں۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کر کے معاملہ رفع دفع کروایا۔ ماضی کا غرفہ کھلتا ہے تو یادوں کے چراغ جل اٹھتے ہیں اور واقعات کا سلسلہ ذہن کے پردے پر فلم کی طرح چلنے لگتا ہے۔ بیت الادویات کی گلی سے گذر کر ایک طویل سا محلہ آتا ہے جس کی بڑی گلی آگے جا کر قصائیوں والے چوک سے ہوتی ہوئی کرنال والی مسجد کی طرف نکل جاتی ہے۔ سید زادے نے یہیں ایک گھر میں بسیرا کیا ہوا تھا۔ شادی کا نقارہ بج گیا۔ بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ مجھے ان کا ولیمہ آج تک اچھی طرح یاد ہے۔ خیال امروہوی نے اپنی سچائی اور ایمانداری پر کبھی سودا نہیں کیا۔ زبوں حال ہوا، زندگی میں دشواریوں اور ناگفتنی مسائل سے دوچار رہا، قدم قدم پر اس کے لئے معاشرتی کربلائیں سجتی رہیں لیکن اپنے آدرش عقیدے، سچ اور حق سے کبھی دست کش نہیں ہوا۔ خدا جانے امروہہ کے اس سید نے پہلی رات اپنی بیوی کو اپنی کونسی کمزوریوں سے آگاہ کیا کہ صبح ٹرک آگئے اور دلہن سامان لاد کر ہمیشہ کے لئے اپنے میکے چلی گئی۔ پیچھے پھر وہی خیال، وہی اقبال اور وہی سبز رنگ کا چین ساختہ بائسیکل۔ لیجئے شاہ صاحب کی کہانی میں اک اور کردار بھی در آیا۔

اقبال...... خدا جانے کون تھا، کہاں سے آیا اور خیال صاحب سے اس کا کیا رشتہ تھا۔ کبھی جرأت نہ ہوسکی کہ اس بارے میں اُن سے استفسار کیا جاتا۔ اتنا معلوم ہوا کہ اس کا تعلق سیالکوٹ یا شکر گڑھ سے تھا۔ اس کی شخصیت میں بڑے شیڈ تھے۔ گھر کی مالکن خیال کی ماں، خیال کا لے پالک، خیال کا ساقی، خیال کی گورنس اور نہ جانے کیا کیا، گورا چٹا، خوش لباس سمارٹ نوجوان، لیکن وقت کی اسٹیج پر اپنا کردار نبھا کر معاشرے

Marfat.com

کی ہاؤ ہو میں کہیں کھو گیا۔ اسٹیج پر لیہ کے شیخوں نے اپنی منڈلی جمالی۔ میرے ساتھ کالج میں اک سانولا اور کمزور سا لڑکا سائنس کا طالبعلم تھا۔ تعلیم میں یقیناً وہ اچھا ہوگا لیکن میرا اس سے تعلق مباحثوں میں شرکت سے قائم ہوا۔ یہ شیخ رحمت اللہ تھا۔ خیالؔ صاحب کی دوسری شادی رحمت اللہ کی ہمشیرہ سے ہوئی۔ میں نے آج تک انہیں دیکھا نہیں لیکن شادی کے بعد جب خیالؔ صاحب اپنی اہلیہ کے ساتھ ہنی مون پر گئے تو بہت سی تصویریں مختلف مناظر کے پس منظر میں کھچوائیں۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں ان میں سے کچھ تصاویر چرا پایا۔ کچھ عرصہ تو وہ تصاویر میرے اثاثے میں رہیں۔ افتادِ زمانہ کے ہاتھوں اُن کے بلیک اینڈ وائٹ رنگ بھی جب پھیکے پڑ گئے تو مجھے یقین ہو گیا کہ میری قابلِ احترام پروفیسرنی کے بالوں میں چاندی اُتر آئی ہوگی۔ جہاں تہاں کی ہجرتوں میں مسافر قریہ قریہ اور چھاؤنی چھاؤنی پھرا کیا۔ جہاں اور کئی قیمتی اثاثے اُتھل پتھل کی نذر ہو گئے وہاں یہ خوبصورت تصویریں بھی کہیں کھو گئیں۔ اس نقصان کا مجھے ہمیشہ قلق رہے گا۔ شیخ خانوادے کی وفا کیش لڑکی نے خیالؔ کو تمام تر اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ اس طرح قبول کیا کہ اس کی اصول پرستیوں کے تھپیڑے کھاتی ہوئی، عسرتوں، تنگدستیوں میں سے گذر کر اُسے اولاد جیسی پیاری جکڑ بندیوں میں کس لینے میں کامیاب ہو گئی۔ یہ الگ بات کہ وہ ڈال ڈال تھیں تو فارسی زادہ پات پات نکلا اور اپنے رنگ میں انہیں رنگ ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔

ایران میں شہنشاہیت نصف النہار پر تھی۔ مطلق العنان رضا شاہ پہلوی نے پورے ملک میں اس طرح سے جاسوسی کا جال بچھا رکھا تھا کہ ہر گھر کا ایک فرد اپنے ہی اہلِ خانہ کے خلاف شاہ کی مخبری کرتا تھا۔ اک چڑیا بھی فی الواقعہ شاہ کی اجازت کے خلاف پر نہیں مار سکتی تھی۔ اگرچہ اپنی پی ایچ ڈی کا صحیح احوال تو خیال صاحب جانتے ہوں گے۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ بادشاہی کے عروج کے دنوں میں مزدک جیسے مسلّم

Marfat.com

کمیونسٹ، ترقی پسند اور باغی ادیب پر ڈاکٹریٹ کرنے کا ارادہ کر لینا شائد خیالؔ جیسے شخص کا ہی گردہ ہو سکتا ہے۔ خیالؔ صاحب مزدک پہ ریسرچ کرنے ایران چلے گئے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ جتنا عرصہ ایران میں رہے ہوں گے، ایجنسیاں سائے کی طرح ان کے پیچھے رہی ہوں گی وہ واپس آئے تو ڈاکٹر ہو چکے تھے۔ وہ لیکچرر تھے تو ایران گئے۔ لیکچرر ہو کر عمر گذار دی اور اسی گریڈ میں ریٹائر ہو گئے۔ اپنی نوکری کے دوران انہوں نے اپنے آدرش اور نظریات کا خوب دفاع کیا۔ دنیا بدل گئی لیکن انہوں نے اپنی ڈگر نہیں چھوڑی۔ زمانے نے ان سے کوئی اچھا سلوک نہ کیا۔ اور زندگی عسرت اور سفید پوشی کی حد عبور نہ کر سکی ان کے پراگندہ حالات کی ذمہ داری بڑی حد تک ان کی لاپرواہی اور بداعتدال پر بھی ڈالی جا سکتی ہے۔ بایں ہمہ خیال اس برے سلوک کے سزاوار نہ تھے جو وقت نے ان کے ساتھ روا رکھا۔ ایسے لوگوں کے لئے کسی نے کہا ہے۔

مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا

Marfat.com

Marfat.com

حصہ دوم

Marfat.com

Marfat.com

ریاض انور کا فنی ارتقاء

یہ غالباً 78ء کے ابتدائی دن تھے۔ایک حادثے کے نتیجے میں میرا پیشہ ورانہ مستقبل اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔میرے سارے خواب چکنا چور ہو گئے اور مجھے آنے والے دِنوں کا آئینہ دکھا دیا گیا۔میں بہت دِنوں تک افسردہ اور ملول رہا پھر آخر دل کو سمجھا بجھا کر ادب کی طرف لگا دیا۔میری پہلی کتاب اس وقت تک شائع ہو چکی تھی۔ پیشہ ورانہ مصروفیت کی وجہ سے میں گذشتہ پانچ چھ سال سے کاغذ اور قلم سے دور ہو چکا تھا۔لہٰذا ایک دفعہ پھر اپنی میز پر قلم اور کاغذ رکھ لیا۔ان دنوں میں ملتان میں تعینات تھا۔وہ شہر ادبی نکتہ نظر سے فی واقعہ ایک مکتبِ فکر ہے۔اور ادبی سرگرمیوں کی ایسی گھما گھمی ہے کہ کوئی دن جاتا ہو کہ شہر میں کہیں نہ کہیں کوئی تقریب برپا نہ ہو رہی ہو۔اس ماحول نے میرے اندر ادب کے سہمے ہوئے طالب علم کو مہمیز دی اور میں وردی سے باہر نکل کر ادب کی دنیا میں کھو گیا۔شعر و ادب کے علاوہ روزنامہ ''امروز'' میں مستقلاً ہفتہ وار ادبی کالم لکھنے لگا۔عرش صدیقی، انوار احمد، اے بی اشرف، ارشد ملتانی، مبارک مجوکہ، محمد امین، [illegible]الی، انور جمال جیسے لوگوں کی محفلوں میں گذرے ہوئے لمحے کبھی نہیں بھولتے۔آہستہ آہستہ میری اِن ناپسندیدہ سرگرمیوں کی رپورٹیں ''اوپر'' پہنچنا شروع ہو گئیں۔ترقی پسندوں کے پیچھے تو خفیہ والے دم کی طرح لگے رہتے ہیں۔ان سے دوستی کی بناء پر میرا نام بھی کتابوں میں چڑھ گیا۔چنانچہ 80ء کے ایک سہانے دن ''بڑے صاحب'' کے دربار میں میری پیشی ہوئی اور مجھے لکھنے پڑھنے کی پاداش میں ''وارننگ'' ٹِکا دی گئی۔میں ابھی اپنی بیگناہی کے زخم سہلا رہا تھا کہ میرے جہلم تبادلے کے احکامات آ گئے۔یار دوست مجھے پرسا دینے

Marfat.com

آئے۔ جہلم تمدنی اور ثقافتی مراکز سے دور ایک ایسا پسماندہ شہر سمجھا جاتا تھا جہاں صرف فوجی پیدا ہوتے ہیں۔ اور عام تاثر میرے فوجی احباب کا یہ تھا کہ یہ میرا شکائتی تبادلہ ہے اور مجھے ایسی جگہ بھیجا گیا ہے جو تہذیبی و ادبی مراکز سے دور ہے اور جہاں مجھے ''غیر قانونی'' حرکتیں کرنے کا موقعہ نہیں ملے گا۔ لیکن یہ تاثر خلافِ واقع نکلا۔ کیونکہ جہلم آج تک میرے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں یادوں کے گلاب مہکاتا ہے۔ میں نے وہاں جو وقت گذارا اور جس طرح اہل قلم دوستوں نے میری پذیرائی کی وہ میری زندگی کا ایک قیمتی اثاثہ ہے۔ ریاض انور کو میں نے یہیں مشاعروں میں تواتر سے سنا۔ اور اکثر اس کی فارسی تراکیب کے طلسم میں کھو جاتا رہا۔ علامہ اقبال کی پیروی کرنے والے (بشمول عبدالعزیز خالد) کہیں بھی اس حسن کی دھول کو بھی نہ پا سکے جو علامہ کی فارسی تراکیب و مصادر میں پایا جاتا ہے۔۔۔۔ میں حیران ہوتا تھا کہ سادہ مراد ریاض انور لاشعوری طور پر اس فارسی آہنگ کو جزو شعر بناتا ہے جو علامہ اقبال کا خاصہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ریاض نے زیادہ تعمق اور تنقیدی نظر سے شائد اقبال کا تفصیلی مطالعہ بھی نہیں کیا ہوگا۔ یہاں سے ریاض انور سے میرا ایسا فکری رشتہ قائم ہوا جو الحمدللہ پچیس سال گذرنے کے باوجود آج بھی قائم و دائم ہے۔ پھر ریاض انور کا پہلا شعری مجموعہ ''نوکِ خار'' زینتِ اشاعت ہوا تو موصوف نے مجھے یہ اعزاز بخشا کہ میں نے ''عرصۂ جبر کا حوصلہ مند عکس گر'' کے عنوان سے ان کے شعری مقام پر اک تفصیلی مضمون لکھا۔ بنجارے نے 83ء میں روتے دل اور بہتے آنسوؤں کے ساتھ جہلم کو خیر باد کہا۔ کیونکہ تبادلہ نئے مستقر پر ہو گیا تھا۔ اس غریب الوطنی میں مسافر قریہ قریہ پھرتا رہا۔ اہل جہلم سے اور ریاض انور سے میرا رابطہ منقطع ہو گیا۔ بہر حال اک طویل عرصے کے بعد ریاض انور کا دوسرا شعری مجموعہ ''آبلوں کا سفر'' منصہ شہود پر آ رہا ہے۔

ریاض انور اک اسلوب گر تخلیق کار ہے۔ اس کا شعری نظام اس کی ڈکشن پر

Marfat.com

بہت مضبوطی سے ایستادہ ہے۔خار اور آبلے جیسے بیسیوں استعارے اور علامتیں اس کے فکری تار و پود میں جہاں تہاں بکھرے پڑے ہیں۔ پہلا مجموعہ ''نوک خار'' تھا تو دوسرا ''آبلوں کا سفر'' ہے۔سرنامے کیلئے ریاض انور نے آبلے اور خار کے تلازمے کو بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔اس کا شعر ہے۔

در پیش آبلوں کا سفر ہے تمام عمر
اک نوکِ خار بھی مرے رختِ سفر میں ہے

یہ اک پوری کہانی ہے جسے ریاض انور نے بڑی جامعیت اور فنی مہارت سے ایک شعر میں سمو دیا ہے۔اس شعر کی تفصیل و تشریح میں جایئے تو اک دفتر درکار ہوگا۔ زندگی سے کشید کردہ سانحات (Tragedies) کو جبر کی پوری ہیئت کے ساتھ ریاض انور نے برداشت کیا اور پھر اسے شعر کے قالب میں کاغذ پر اُتار دیا۔نشتر اور زخم کے اندوہناک کھیل سے ریاض انور عمر بھر دست آزما رہا۔اور بات کچھ ایسی رہی۔

دِل کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے اُنہیں یاد کرنے لگتے ہیں

ریاض انور کی ادبی شخصیت دو واضح خانوں میں بٹی ہوئی ہے۔اپنی افتادِ طبع میں وہ ایک زبردست ٹریڈ یونینسٹ، اک پکا ترقی پسند اور معاشرے کے خونخوار درندہ نما انسانوں کے گریبانوں میں ہاتھ ڈالنے والا کٹر انقلابی ہے۔لیکن اس کا دل رومانیت سے لبالب اک ایسا سادھو ہے جو عشقِ رسول ﷺ میں لتھڑا ہوا ہے۔ ریاض انور کے فکری نظام میں روحانیت کا مرحلہ وار ارتقاء نظر آتا ہے۔''نوک خار'' میں بھی نعت کا اک تجربہ ہمیں ملتا ہے۔لیکن اس تجربے میں بنت اور گھاڑت کی شعوری کوشش بہت واضح ہے۔ جبکہ ''آبلوں کا سفر'' میں جو نعتیہ کلام شامل ہے۔اس میں بیخودی، والہانہ پن اور عشقِ رسول ﷺ کی اونچی منزلوں کی کا پتہ ملتا ہے۔شاعر نے اپنی نعتوں میں کہیں ادبی قرینے

Marfat.com

اور لفظی سلیقے کے شعوری ادراک کا خیال نہیں کیا، بلکہ اک وارفتگی اور بے خودی کا عالم ہے جو لفظوں میں ڈھل رہا ہے۔

میں سلگتا ہوں ہوائے یثرب
کھل کے چل مجھ کو بھی جلنا آئے

لطف و کرم کے ہاتھ ہیں جو دوسخا کے ہاتھ
میری نبیؐ کے ہاتھ ہیں میرے خدا کے ہاتھ

گوش بر آواز رہتا ہوں کہ کب آئے پیام
کب بلاوا آئے گا اس عاشقِ مہجور کا

جواب سنگ زنی کا تیری دعائیں ہیں
تری سزائیں بھی کتنی عجب سزائیں ہیں

نعت گوئی ایک مشکل ترین میدان ہے۔ کیونکہ یہاں جذبے اور شریعت کے درمیان انتہائی باریک سی لکیر ہے اور ایک اچھے نعت گو کو اس حساس لکیر کا خیال کر کے چلنا ہوتا ہے۔ ذرا سی غلطی اور جذبے کا بیکراں وفور آپ کو شرک میں دھکیل سکتا ہے۔ ریاض انور نے اپنے تمام تر جذباتی طرزِ احساس کو اس تفریق کے اندر باندھ کر رکھا ہے۔ یہ صلاحیت مظفر وارثی اور حفیظ تائب میں نظر آتی ہے۔

لوٹا نہیں کشکول یہاں سے کوئی خالی
اے مانگنے والو میری سرکارؐ سے مانگو

شب گزیدہ ہوں کبھی نورِ سحر کو دیکھوں
بخت جاگیں تو دعاؤں کے اثر کو دیکھوں

میں یہ سنتا ہوں وہاں نور برستا ہے مدام
جنتِ ارضی کو اس نورنگر کو دیکھوں

Marfat.com

پچیس سال فکری مشقت کیلئے اک طویل عرصہ ہوتا ہے۔ ''نوکِ خار'' میں ریاض انور ایک دہکتا ہوا آلاؤ تھا۔ ایک ''اینگری ینگ مین''۔ ہر بات میں انقلاب اور ہر شعر میں سماجی افراط و تفریط کا گلہ۔ اس وقت ریاض انور اک جوان فکری عمل سے گذر رہا تھا چنانچہ ''نوکِ خار'' کا آہنگ (غزل کے حوالے سے) بڑا ''لاوڈ'' اور پاٹ دار ہے۔ رجائیت کا دامن اس وقت بھی ریاض انور نے بڑی مضبوطی سے تھاما ہوا تھا جب وہ زندگی کی آس میں کنکر ابالنے کی نصیحت کرتا تھا۔ لیکن اس وقت ریاض کا شعر خون کو اتنا گرم کر دیتا تھا کہ پڑھنے والا فولاد سے ٹکرا جانے کی ہمت اپنے اندر محسوس کرتا تھا...... وقت نے ریاض انور کو بہت کچھ سکھایا ہے اور آج پچیس سال بعد اس کے لہجے میں مجھے تجربات کی واضع جھلک نظر آتی ہے۔ اس کے ہاں فیض جیسا ٹھہراؤ آ گیا ہے۔

الجھنے لگ گیا تھا خود ہوا سے
نہیں تو پھول ایسے کیوں بکھرتا

میں منسلک ہوا نہ کسی سلسلے کے ساتھ
میں وقت کی طرح ہوں خزاں کا بہار کا

عشق کے صحرا میں اک لمبا سفر کرنا پڑا
آنسوؤں سے خشک ہونٹوں کو بھی تر کرنا پڑا

اندھے شیشے ٹوٹیں گے احوال سنائیں گے
شیشہ گر خاموش رہے گا پتھر بولے گا

زبان اور نغمگی کا یہ رنگ بھی ملاحظہ کریں۔

جو گھر سے نکلا تھا ڈگمگاتا سنبھل پڑے گا
کسے خبر تھی کہ یہ اپاہج بھی چل پڑے گا

کوئی تو پھر تشنہ کام رگڑے گا ایڑھیوں کو

Marfat.com

ابھی چٹانوں سے کوئی چشمہ ابل پڑے گا
ابھی سے اس پر نہ بانجھ پن کا گمان کرنا
نیا شجر ہے یہ بور دے گا یہ پھل پڑے گا

گذشتہ پچیس سال کے ادبی سفر میں ریاض انورؔ کے ہاں بہت سی فکری تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ علامہ اقبال نے ''نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھا' والا لہجہ کچھ عرصے کیلئے اپنایا۔ یہ وہ دور تھا جب وہ داغ سے متاثر تھے۔ پھر ان کے ہاں یکا یک (Abrupt) تبدیلی نظر آتی ہے۔ ریاض انور شائد یکسر تبدیل نہیں ہوا لیکن اک ارتقاء سے گذر کر غزل میں اس کا لب ولہجہ ''نوکِ خار'' سے بہت ہی مختلف ہے۔ اس تبدیلیٔ ہیت سے ریاض انور کو جہاں بہت سے فوائد حاصل ہوئے وہاں کچھ پہلو نقصان کے بھی ہیں۔ ''نوکِ خار'' کا ماحول کچھ ایسا ہے جیسے ایک بڑا اپنڈال سجا ہے۔ شامیانہ تنا ہوا ہے اور ریاض انور اپنے سارے لفظی طمطراق کے ساتھ اپنا کلام سنا رہا ہے۔ بھاری بھرکم الفاظ اور پھر اتنا ہی اُن کا صوتی انگ۔ ریاض انور مقناطیس کی طرح قاری کی توجہ کھینچ لیتا تھا۔ اس کا مخاطب (Intelligentia) طبقۂ دانشوراں نہیں تھا بلکہ گلی کوچے کا فرد تھا۔ ''آبلوں کا سفر'' میں ریاض انورؔ نے فارسی کو ایک طرف رکھا۔ شوکتِ لفظی کو تیاگ دیا۔ سادگی اور پُرکاری کو وطیرہ بنایا۔ غیر ضروری اور گنجلک طرزِ احساس کو ترک کر کے سادہ لفظوں میں فلسفے کی مرصع کاری کی ہے۔ اس کے انحراف کا ایک نمونہ ملاحظہ کریں۔

فاصلہ طے شتاب کر لینا
زندگانی حباب کر لینا
گنتے رہنا گناہ سب اپنے
زندگی میں حساب کر لینا
اب اک دشت کا کونہ ہو گا

Marfat.com

اپنا خاک بچھونا ہوگا
جینا بیگانہ سا ہو کر
ان ہونا سا ہونا ہوگا

لگا رہا ہے وہ کیوں خونِ رائیگاں کا حساب
جسے شکست ہوئی اس کو خوں بہا نہ ملا

یوں تو نغمگی آغاز ہی سے ریاض انور کا خاصہ رہی ہے کیونکہ اُسے لفظ کے صوت و آہنگ سے کھیلنے کا سلیقہ آتا ہے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اور تجربات کی کٹھالی سے کندن ہو جانے پر اس کے صوت و آہنگ سے کھیلنے کے سلیقے میں بہت پختگی آ گئی ہے۔ ''نوکِ خار'' میں بھی گنگناہٹ کا پس پردہ احساس قاری کو قدم قدم پر ملتا تھا لیکن شوکتِ لفظی تلے یہ احساس دب جاتا تھا ''آبلوں کا سفر'' میں نغمگی اپنے طمطراق سے نمایاں ہوتی ہے۔ اور پھر اُس نغمگی کو تکرارِ لفظی نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔

ہمارا توشہ خجالتیں ہی خجالتیں ہیں
ہم اپنے اعمالِ بد کا دیں گے جواب کیا کیا

زندگی اپنی قرینہ اپنا مرنا اپنا ہے تو جینا اپنا
پیرہن اور گریباں داماں چاک اور چاک کا سینا اپنا
اپنا قلزم ہے تو لہریں اپنی اپنا دریا ہے سفینہ اپنا

گذشتہ پچیس سال میں ریاض انور کے شعری نظام میں جو تبدیلی آئی ہے، اُسے کمال کی تبدیلی کہا جا سکتا ہے۔ یہ تبدل جہاں ریاض انور کیلئے مستقبل کی وسعتیں اور طبع رواں کیلئے جولانیوں کا بے بسیط میدان لایا ہے۔ وہاں یقیناً ریاض کو کچھ چیلنج بھی درپیش ہوں گے۔ فارسی سے سلیس زبان کی طرف مراجعت سے ریاض انور کی زبان ڈھل گئی ہے۔ اس کی محاوارتی دروبست، لفظوں کی صناعی اور پھر براہِ راست خیال آرائی

Marfat.com

نے اُس کی غزل کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اُس کے سامنے اب نئے تجربوں کا اک وسیع میدان بکھرا پڑا ہے۔ اب وہ زیادہ آسانی کے ساتھ غزل کی خاص طور پر تزئین و آرائش کر سکتا ہے۔ اس مثبت تبدیلی پر میں ریاض انور کو مبارک باد دیتا ہوں۔ ریاض انور کے راستے میں اب کچھ مشکلات بھی آئیں گی جنہیں میں محسوس کرتا ہوں۔ اردو شاعری میں اتنے تجربے ہو رہے ہیں اور ایسی ایسی بھانت بھانت کی نئی دریافتیں وجود میں آ رہی ہیں کہ الامان والحفیظ۔ جب تک ریاض انور فارسی کے طمطراق سے مرعوب رہا تو غیر محسوس طور پر اس کی اک علیحدہ سی دلکشی بھی وجود میں آتی چلی گئی اور اس کی آواز کی انفرادیت کا احساس توانا ہوتا چلا گیا۔ اب وہ دریا سے نکل کر سمندر میں آ گیا ہے، جہاں کی شناوری جان جوکھم کا کام ہے۔ وہ اک کوچے میں صدا دیتے دیتے ایک ریلوے پلیٹ فارم پر آن چڑھا ہے جہاں ہزاروں آوازوں کا حشر بپا ہوتا ہے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اور یہاں پر ریاض انور نے اپنی آواز کو اتنا لاؤڈ اور ممتاز کرنا ہے کہ وہ بولے تو ہر کان اس کی طرف متوجہ ہو جائے اور ہر آنکھ اسے دیکھنے کی تمنائی ہو۔ اس مقام تک پہنچنے کیلئے ریاض انور کے سامنے منزلوں کی طویل مسافت بچھی ہوئی ہے۔ ریاض انور اک مستقل مزاج شاعر ہے۔ تخلیق اس کے خون میں شامل ہے وہ طبعاً اور فطرتاً شاعر ہے۔ اس کا مشاہدہ بہت ہی توانا ہے۔ اس مشاہدے کو کاغذ پر انڈیلنے کے فن سے وہ کماحقہٗ واقف ہے۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے راستے میں آنے والی مشکلات کو روندتا ہوا آگے سے آگے کی منزلوں کا سفر جاری رکھ سکے گا۔ میری ڈھیری نیک تمنائیں اور دعائیں اُس کے ساتھ ہیں۔

Marfat.com

سید احمد اختر......ایک مطالعہ

حاضرینِ کرام! یہ 77ء کا واقعہ ہے۔ ملک عزیز میں کچھ سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں میری تعیناتی مانسہرہ ہوگئی۔ مانسہرہ نیا نیا ضلع بنا تھا اور انتظامی لحاظ سے اس کی بے سروسامانی کا وہی عالم تھا جو 47ء میں پاکستان کا تھا۔ میرے فرائض کی نوعیت ایسی تھی کہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے اٹھارہ گھنٹے مجھے ڈپٹی کمشنر سے رابطہ رکھنا پڑتا تھا۔ اس رابطے کی نوعیت کچھ مطالباتی قسم کی تھی۔ دوسرے معنی میں میرے انتظامی فرائض کی ادائیگی کا انحصار ڈپٹی کمشنر کے تعاون اور استعداد پر تھا۔ یوں تو رابطہ ٹیلیفون پر ہی زیادہ تر رہتا تھا۔ لیکن جب میں ایک دفعہ ملنے گیا تو صاحب بہادر مجھے بہت اچھا لگا۔ میرے سامنے میز کے اُس پار ایک انگریزیاں بولتا ہوا چاک و چوبند شخص کوٹ پینٹ ڈائے بیٹھا ہوا تھا۔ میں اُس کے دفتر میں دو گھنٹے بیٹھ کر کافی کے ساتھ ساتھ اُس کے طریقۂ کار کی چسکیاں لیتا رہا۔ یہی وہ وقت تھا جب کیوپٹ نے تیر چلایا اور میرے دل نے اُس سے دوستی کرنا چاہی۔ وہ بے پناہ قوت فیصلہ کا مالک تھا اور آج بھی ہے۔ اس کے زندگی کے بارے میں تصورات بڑے مستقیم تھے اور آج بھی ہیں۔ وہ ضلع مجسٹریٹ کی حیثیت میں ہر ٹائپ شدہ اور لکھے ہوئے کاغذ کی جزئیات میں جھانکتا تھا اور میں نے ماتحت اہلکاروں کو اس کے دفتر میں کانپتے ہوئے ان گناہ گار آنکھوں سے دیکھا اور آج بھی طالب علموں کو لرزاں دیکھتا ہوں کیونکہ وہ اپنی تمام تر بیماریوں کے ساتھ ایک ایک لفظ کا سپیلنگ، گرائمر کے دروبست اور زبان کی خامیوں کو چیک کرتا ہے اور آخر میں بڑے خوبصورت ریمارکس دیتا ہے۔ یہی ریمارکس اچھے طالب علم کیلئے زادِ راہ ہیں۔

Marfat.com

سعید احمد اختر مجھے معاف کرنا۔ میں تمہاری بزرگی کے باوجود تمہارے لئے صیغہ واحد استعمال کر رہا ہوں۔ دراصل میرا یہ ایمان ہے کہ محبت اور عقیدت میں کسی آپ جناب کی ضرورت نہیں رہتی۔ جب انسان عقیدت اور جذبہٗ بندگی سے معمور ہو کر خدائے بزرگ و برتر سے مخاطب ہوتا ہے تو اس کا ہر دلعزیز لفظِ تخاطب ''تو'' ٹھہرتا ہے۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور محبت کے اظہار کیلئے تہذیبی رکھ رکھاؤ کے جھنجھٹوں میں نہیں پڑنا چاہتا۔ یہ میری مجبوری ہے۔

سعید احمد اختر ایک بڑا آدمی ہے اور ہر بڑے آدمی کی طرح اس کے خیر خواہوں اور بدخواہوں کی ایک لمبی قطار اس کے فنی ڈیل ڈول کے پیچھے چھپی ہوئی ہے۔ اور وہ مدح و تشنیع سے بے نیاز اپنے فنی سماجی اور مذہبی عقیدوں اور آدشوں کی پوری توانائی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ آج تک اس کے خیر خواہ اُسے پھسلا نہیں سکے اور اُس کے بدخواہ اُسے بھٹکا نہیں سکے۔ وہ جتنا سچ سمجھتا ہے، اُسے پوری طاقت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اور کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتا۔ اُس نے کل کے خاور سے بھی یہی کہا تھا کہ طالب علم ہو سائیکل یا ٹانگے پر پڑھنے جاؤ۔ اگر گاڑی پر پھرنا چاہتے ہو تو گاڑی والے بن کر دکھاؤ اور وہ آج کے خاور سے بھی یہی بات کہتا ہے۔ یہ اُس کا ایمان ہے۔

حاضرین کرام! سعید انگریزی ادب کا آدمی ہے۔ اُس نے انگریزی پڑھی اور پڑھائی ضرور ہے مگر اس انگریزی سے مرعوب نہیں ہوا۔ اس نے انگریزی کو ذہنی وسعت کا ایک ذریعہ ضرور سمجھا ہے مگر ابلاغ کیلئے اُسے سیڑھی نہیں بنایا۔ وہ فیشن اور رواج کا شاعر نہیں بلکہ اُس کی شاعری شعوری کوششوں کا ایک تابندہ نمونہ ہے۔ میں گذشتہ بیس سال سے سعید اختر کو پڑھ رہا ہوں۔ مجھے اپنے شعر کبھی یاد نہیں رہتے مگر سعید احمد اختر کی غزلیں زبانی یاد ہیں۔ سعید احمد اختر غزل کا باکمال حرف گر ہے اور میں یہ بات اجمالاً نہیں کہہ رہا۔ غزل اُردو میں ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس پر گذشتہ ساٹھ ستر سال میں بڑے

Marfat.com

تجربے کئے گئے۔ جدیدیت اور تجرید کے نام پر اس بیچاری کے ساتھ کیا کیا ظلم روا نہیں رکھا گیا۔ اس کے پیکر پر طالع آزماؤں نے کیا کیا پھاوڑے چلائے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب بھی غزل کے بنیادی عناصر کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی گئی تو شاعر ہمیشہ بھٹک گیا۔ اک نئی صنفِ سخن بھلے معرضِ وجود میں آ گئی لیکن خیال چیستان ہو گیا۔ اور وہ پیکر فکر نہ تراشا جا سکا، جو غزل کا خاصہ ہے۔ سعید احمد اختر اس پورے پس منظر سے شعوری طور پر آگاہ ہے۔ اُس نے غزل کے کلاسیک کو ہرگز نہیں چھیڑا۔ اور غزل کی تہذیبی قیود میں رہ کر خیالات کے رنگ بھرے ہیں۔ اُس کی اس تعلیم یافتہ کوشش سے عروسِ غزل پر بڑا نکھار آیا ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے، بھرپور انداز میں کہہ جاتا ہے اور پندارِ غزل کو کہیں زخمی نہیں ہونے دیتا۔

چھوڑ تا دِل نہ تیرا شہر، مگر کیا کرتا
نام لیتی نہ ترا عقل، مگر کیا کرتی

آس آنکھوں سے، تڑپ دل سے، خوشی گھر سے گئی۔
تیری صورت نہ مگر یاد کے منظر سے گئی

دوستو میرے اندھیروں کی تمنا ہے یہی
روشنی سی جو ابھی میرے برابر سے گئی

وہ میرے خواب تھے کہ بہاروں کے ناچ گھر
میرا شباب تھا کہ بگولہ سفر میں تھا

میں نے جب بھی سعید احمد اختر کو کسی نئے زاویئے سے پڑھا تو مجھے لطف کا اک تازہ احساس ہوا۔ "دیارِ شب" جب شائع ہوئی تو اختر نے ایک نسخہ مجھے بھی عنایت کیا تھا، اُس نسخے کو میں آج تک سینے سے لگائے پھرتا ہوں۔ جب بھی اُس کے اوراق کھولتا ہوں تو مرزا غالبؔ مجھ سے ہمکلام ہوتے نظر آتے ہیں۔ کچھ یوں ہوتا ہے کہ کبھی اختر

Marfat.com

انیسویں صدی کا باشندہ محسوس ہوتا ہے تو کبھی غالبؔ کھینچ کر میرے دور میں سانس لیتا نظر آتا ہے۔ اور پھر میں سوچنے لگتا ہوں کہ انسان کے سماجی حالات آج بھی نہیں بدلے اور آج بھی کٹھنائیاں اتنی ہی گھمبیر ہیں جتنی انیسویں صدی میں تھیں۔ مرزا غالب کبھی خضر کی شکایت کرتے تھے تو کبھی فرشتوں کے لکھے ہوئے کو ماننے کیلئے تیار نہیں تھے اور کبھی وہ فرعون کی خدائی کا استفسار کرتے ہوئے دکھائی پڑتے تھے۔ مرزا غالبؔ کی اس تشکیک کے پس پردہ وہ نفسیاتی اور تجرباتی عوامل تھے، جنہیں مشاہدہ کر کے اور اُن کے اندر جھانکنے کے بعد حساس شاعر روز مرتا ہے اور روز جیتا ہے۔ سعید احمد اختر کے ہاں یہ مشاہدہ بڑی توانائی کے ساتھ جلوہ فرما ہے۔ وہ غالب سے زیادہ پڑھا لکھا آدمی ہے اور غالبؔ سے کہیں زیادہ بڑے معاشرے کا باسی ہے۔ اُس کی تشکیک بھی اُسی شرح سے فزوں تر ہے۔

بت کیا ہیں، بشر کیا ہے، یہ سب سلسلہ کیا ہے
پھر میں ہوں مرا دِل ہے مری غارِ حرا ہے
جو آنکھوں کے آگے ہے یقین ہے کہ گماں ہے
جو آنکھوں سے اوجھل ہے خلا ہے کہ خدا ہے
شیطان بھی رہتا ہے مرے دِل میں خدا بھی
اب آپ کہیں دِل کی صدا کس کی صدا ہے

عالم تشکیک میں اختر کبھی کبھی قنوطیت کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔ اور اس قنوطیت میں میرؔ کی طرح صرف رومانوی کیفیت نہیں بلکہ اُس آنکھ کے مشاہدے کا اظہار ہے جو معاشرے کو دیکھتی ہے اور کیمرے کی طرح دُکھی مناظر کو محفوظ کر لیتی ہے۔

دشت رقصاں ہیں مرے شہر کے بازاروں میں
چاند غائب ہے مری رات کی پیشانی سے۔

Marfat.com

زندگی چھین کے لینی ہے تو لے لو کہ یہاں
موت مانگو بھی تو ملتی نہیں آسانی سے
ہمارے گھر کے تو اوپر بھی گھر ہیں نیچے بھی
زمین مل نہ سکی ہم شجر میں رہتے ہیں
بتائیں کونسی منزل دکھائیں کون سا گھر
کہ تیس سال سے ہم رہ گذر میں رہتے ہیں
آزادیاں کہاں کہ پرندے بھی قید ہیں
پھیلی ہوئی مہیب ہوا کے حصار میں
حیرت کی بات ہے کہ وہاں جی رہے تھے لوگ
گو شہر میں کہیں بھی ہوا کا گذر نہ تھا

سعید احمد اختر کلاچی کا فرزند ہے۔ کلاچی وہ سرزمین ہے جو پشتون ہے نہ سرائیکی۔ آج بھی وہاں کھڑوا انگ ترنگ واچا واجیسا ملغوبہ بولا جاتا ہے۔ ستم ظریفی جہالت دیکھئے کہ میں اک عرصے تک اختر کو کلاچی میں آباد ہونے والا مہاجر سمجھتا رہا۔ وہ بولتا ہے تو اُس کے لب و لہجے سے کہیں پہاڑوں کی سی سختی یا دریائے سندھ کی نرم ملائم مٹی کے اثرات کا شائبہ نہیں ملتا۔ اُس نے شعوری کوشش کے ساتھ اُردو زبان کو مکمل تہذیبی اقدار کے ساتھ اپنایا ہے۔ نہ صرف یہ کہ اُس کے صفحات پر بکھرے لفظ و خیال اُس کی محنتوں کا پتہ دیتے ہیں بلکہ گفتار و تخاطب میں بھی اُس نے زبان کے سارے سلیقوں کا احترام کیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگ تعمیر سے زیادہ تخریب میں دستگاہ رکھتے ہیں۔ اور ہزاروں سالوں سے بنی ہوئی چیزوں کو آناً فاناً تباہ و برباد کرنے میں ید طولیٰ کے مالک ہیں۔ سعید احمد اختر کے ہاں الفاظ رقص کرتے اور گنگناتے ہوئے ملتے ہیں۔ اس قدر خوبصورت تراکیب اُس نے استعمال کی ہیں کہ کبھی کبھی قاری اس کی چابکدستی پر حیران ہو جاتا ہے۔ نمونہ دیکھئے۔

Marfat.com

مان لیتا ہوں کہ بے داغ نہیں تھی لیکن
لاتو رکھی تھی ترے در پہ جوانی میں نے
میں نے جتنے بھی تعلق تھے سبھی توڑ دیئے
کر دیا تیرے لئے خون کو پانی میں نے
خون بہتا ہے مگر زخم کہاں ہے جانے
درد ہوتا ہے مگر جانے کہاں ہوتا ہے
ہر شام سسکتی ہوئی فریاد کی وادی
ہر صبح سلگتا ہوا صحرا ہے صدا کا
اپنے بچوں کو بھی اس پیار سے کم پالتے ہیں
جس طرح ہم تیرے ارماں ترے غم پالتے ہیں

سعید احمد اختر اپنے ہمعصر انگریزی دانوں کی طرح انگریزی سے مرعوب نہیں ہے۔ اس نے ہر صنف شعر میں طبع آزمائی کی ہے اور اس کوشش میں انتہائی کامیاب رہا ہے۔ میرے نزدیک غزل اُس کا سب سے بڑا حوالہ ہے اور اسی وجہ سے بات گھوم پھر کر اس کی غزل گوئی کی طرف آجاتی ہے۔ اختر نے کئی دوسرے شعراء کی طرح بھدے تجربات کر کے غزل کا حلیہ نہیں بگاڑا، بلکہ قدم قدم پر اس کی کلاسیک کا احترام کیا ہے۔ اور صرف تجریدیت یا جدیدیت کے شوق میں پندارِ غزل پر پھاوڑے نہیں چلائے۔ مثلاً غزل کے مزاج کا مکمل نمونہ آپ کو ان اشعار میں ملتا ہے۔

غریب خانے میں آپ آکر جو بس گئی ہو
بتاؤ تم رنگ ہو کہ خوشبو کہ راگنی ہو
ٹوٹ کر آن جھکی سامنے ٹہنی ایسے
پھول پر چاند کے دیدار کا در بند ہوا

Marfat.com

لاکھ انقلاب آئے دوستی رہی لیکن
پیار کے گھرانے کی، حسن کے قبیلے سے
میں آفتاب کے رتھ میں بھی اُس کے گھر جاؤں
تو کیا یقیں ہے کہ وہ برف مسکرا دے گی
کرن کی پھول کی ریشم کی آبشار کی بات
ہر ایک بات ہے دراصل تیرے پیار کی بات
خوش ہوا تھا دِل خزاں میں شاخ پر گل دیکھ کر
پاس جا کر چومنا چاہا کہ تتلی اُڑ گئی
دیکھتے دیکھتے بن جائے گی گھر کی صورت
چار دن اور نہ جاؤ مرے ویرانے سے
ٹیس ہلکی ہو تو اب آہ نہیں بھرتا دِل
درد کم ہو تو بہل جاتا ہے بہلانے سے

غزل کا کوئی پہلو ایسا نہیں جسے اختر نے جولان گاہِ فکر نہ بنایا ہو۔ اس نے لمبی بحر کی غزل کہی تو یہ یقین کر لیا کہ لمبی بحر کے تمام لوازمات پورے ہوں۔ اس کی یہ غزلیں غنائیت اور ترنم سے لبالب ہیں اور لفظ کھنکتے ہوئے اور جلترنگ بجاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ وہ چھوٹی بحر پر آیا تو چھوٹی بحر کے سارے سلیقوں کو اپنے ساتھ لیکر چلا اس نے سہل ممتنع میں بات کی تو اس کو قاری کیلئے اتنا مشکل بنا دیا کہ نقل یا تقلید کرنا ممکن نہ رہے۔ سعید احمد اختر کی یہ شعری خصوصیت ایک لمبی تفصیل کی متقاضی ہے اور ہر پہلو پر ایک سیر حاصل تبصرے کی ضرورت ہے مگر طوالت کے خوف سے میں سعید کی چند لمبی بحروں، چھوٹی بحروں اور سہل ممتنع کے چند حوالے پیش کرتا ہوں۔ لمبی بحروں کی غنائیت اور ترنم ملاحظہ فرمائیے۔

Marfat.com

نہ پوچھیے ہم چمن سے کیسے وفا کی حرمت بچا کے نکلے
رہے تو آہیں دبا کے بیٹھے چلے تو آنسو چھپا کے نکلے
اسی کا دریا، اسی کے ساحل، اسی کی ناؤ، اسی کے چپو
خدا کی دنیا میں اختیارات سب کے سب ناخدا کے نکلے
پھولوں سے بھرے میخانے تھے، کلیوں کی طرح پیمانے تھے
پر کیا کرتے ہم لوگ وہاں کچھ دشمن کچھ بیگانے تھے
اس عمر میں کیا ایماں لائیں، اس وقت کوئی کافر نہ ملا
جس وقت ہمارے سجدوں میں بت خانے ہی بت خانے تھے
کیا بات ہے کاکل جاناں کی، سنورے تو چمن، بکھرے تو جنوں
مہکے تو صبا، پھیلے تو گھٹا، لپٹے تو قضا ہو جاتی ہے
لال گلابی سرخ سنہرے اُودے نیلے پیلے پر
کرنیں بن کر ناچ رہے ہیں پھولوں کے چمکیلے پر

اب ذرا چھوٹی بحر ملاحظہ فرمائیں اور خود انصاف کریں کہ اس تنگنائے سخن سے سعید اختر نے کیا انصاف برتا ہے۔

سڑک بجھ گئی آنکھ اندھی ہوئی
دریچہ کھلے کا کھلا رہ گیا
بہت دور پیچھے میری ناؤ سے
خدا رہ گیا، ناخدا رہ گیا
موت کو زندگی بنا لے گا
عمر بھر تیرا روگ پالے گا
جگنوؤں کو تلاش کرتا ہے

Marfat.com

مفت میں انگلیاں جلالے گا

میری بے خواب آنکھوں نے ہمیشہ
تمہاری نیند مانگی ہے خدا سے
جوانی ان کی چھپ کر آگئی ہے
فسانے جھانکتے ہیں ہر ادا سے

ذرا سہلِ ممتنع کی کیفیت بھی سنئے۔اختر کہتا ہے۔

رات کیسے بیتے گی
چاند ہے نہ سائے ہیں
چاند نے چکوری سے
فاصلے چھپائے ہیں
میں فقیر ہوں دعا ہے
مرے پاس اور کیا ہے
قول پورا نہ ہو سکا ہم سے
ایک بس ان کو بھول جانے کا

حضراتِ گرامی! میں نے لندن نہیں دیکھا۔نذیر اشک نے بھی نہیں ‍ اور یقیناً آپ میں سے پچانوے فیصد نے نہیں دیکھا۔ جولوگ لندن دیکھ کر آتے ہیں، وہ ورڈز ورتھ کو گالیاں دیتے ہوئے نظر آئے ہیں کہ بدبخت نے دریائے ٹیمز کا ویسٹ منسٹر سے ایسا نقشہ کھینچا کہ ہم دھند میں لپٹے ہوئے صبح صادق میں سانس لیتے ہوئے شہر کا نظارہ دیکھنے چلے گئے۔لیکن ٹیمز کے پیٹ میں وہ ساری گندگی موجود ہے جوشہر کے قریب سے گذرنے والے کسی بھی دریا کا مقدر بنتی ہے۔ ویسٹ منسٹر برج سے کھڑے ہوکر دیکھیں تو شربتوں کے خالی ٹین اور خوردونوش کا دیگر پیکنگ میٹریل جہاں تہاں دریا کی

Marfat.com

پسلیوں میں ھچکولے کھاتا نظر آتا ہے۔ لیکن ورڈز ورتھ نے اپنی امیجری سے ایسا منظر باندھا کہ ویسٹ منسٹر برج اور دریائے ٹیمز زندہ جاوید ہو گئے۔ سعید احمد اختر نے خالصتاً مشرقی زاویہ نظر سے "سکھر بیراج کی ایک شام" کے عنوان سے سکھر والے پل سے، دریائے سندھ کے نظارے کو لفظوں میں سمویا ہے۔

شام کی ٹھنڈی ہوا
اور گرمی کے مہینوں کا لبالب دریا
ڈوبتے دن کی شعاعوں میں تڑپتی ہوئی ضو پاش روپہلی موجیں
شورِ دریا میں کنارے کی خموشی کا فسوں
اپنے نظارے سے مدہوش ہے مرطوب فضا
تیری آنکھوں کی طرح
دور اس پار گھنے پیڑ دایا پہ
کس طرح تیرتے پھرتے ہیں گلابی بادل
اور شفقائے ہوئے پانی کو
چومتا یوں نظر آتا ہے سمٹتا سورج
شام کو آگ کی دیوی جیسے
غسل کرنے کیلئے
اپنی جلتی ہوئی رتھ چھوڑ کے تاروں کے قریب
بال کھولے ہوئے چاندی کے سمندر پہ اتر آئی ہو

سعید اپنے قاری کو کسی بچے کی طرح انگلی پکڑا کر لے چلتا ہے اور منظر پہ منظر دکھاتا چلا جاتا ہے۔ اس سارے عرصے میں اس پر خود کلامی کی کیفیت طاری رہتی ہے، وہ بظاہر تمام مناظر کی خوبصورتیوں کو اپنے محبوب کے حسن و جمال کے پیمانوں سے ناپ رہا

Marfat.com

ہوتا ہے۔آخر جب شام کی چادر میں سنہری لہریں کھو جاتی ہیں اور دن کے نظاروں کی بہار سو جاتی ہے تو وہ محبوب کے ساتھ اس طرح گھر لوٹتا ہے۔

آ بس اب لوٹ چلیں
چاند کی بارھویں ہے
اور کچھ دیر کے بعد
اپنی بکھری ہوئی زلفوں میں ستارے ٹانکے
رات آ جائے گی آغوشِ محبت لے کر

سعید احمد اختر کی شاعری دراصل اس کے لمحہ لمحہ بیتے ہوئے دنوں کی کہانی ہے۔ اس کی سچائیاں بڑی ننگی اور دوٹوک ہیں۔ وہ خود کو قاری کی ملکیت سمجھتا ہے اس کی کلیات پڑھ لی جائیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ اختر کے ہمراز ہیں اور لڑکپن سے لے کر اس کی آج عرق النساء سے محبت تک قدم قدم اس کے ساتھ رہے ہیں۔ اس کی نظم ''اندیشے'' پڑھئے۔ اس نے کسی پھکو پن کا مظاہرہ کئے بغیر اور جوش ملیح آبادی کی طرح نرگیست کا شکار ہوئے بنا ایک سچائی کو کتنے خوبصورت پیرہن میں پیش کیا ہے۔ اور انسانی جبلت کو کتنی دلکش ٹریٹ منٹ دی ہے۔ یہ کہانی ہم سب بڑی عمر کے لوگوں کی کہانی ہے۔ مگر ہماری منافقتوں نے ہمیں ڈرپوک بنا دیا ہے۔ سعید معاشرے کا بہادر بچہ ہے۔ لیکن خوبی دیکھئے کہ اِن اندیشوں کے اظہار میں اس نے شائستہ رومانی حجاب کو کہیں جنس کے تصور سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ آج سے تقریباً پون صدی پہلے سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے ادب میں بھی بغاوت اور انقلاب کے جذبے در آئے تھے۔ جسے دیکھئے بغاوت کا جھنڈا اٹھائے کو بتائیں ہوا میں اچھال رہا ہے۔ میرے نزدیک مزاحمتی ادب کی بنیاد اسی دور میں رکھی گئی۔ کرشن چندر، میرا جی، ساحر، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، اسرار الحق مجاز اور فیض کے علاوہ سینکڑوں ایسے تھے جو اک نئے انقلاب سے ادب کو متعارف کرا رہے تھے۔ انجمن

Marfat.com

ترقی پسند مصنفین اور بعد ازاں حلقہٗ ارباب ذوق انہی دنوں کی یادگاریں ہیں۔ اس وقت شاعر سماج سے ٹکرا رہا تھا، بغاوت پر آمادہ تھا مگر مآل اور نتیجے سے بے خبر تھا۔ آج سعید احمد اختر بھی بغاوت کرتا ہے لیکن اس مکمل شعور کے ساتھ کہ اس بغاوت کا نتیجہ کیا ہوگا اور اس نتیجے کے اثرات کو پوری طرح قبول کر کے وہ بغاوت کرتا ہے۔ اس کی نظم ''بغاوت'' پڑھیے۔

چند فرسودہ روایات کو ٹھکرا کے اگر
ایک مزدور نے محلوں سے بغاوت کر دی
اور میرے شکوہٗ مجروح نے جرأت کر کے
اپنے سردار کی بیٹی سے محبت کر لی
تو ہوا کیا مری محبوب کہ دنیا کا نظام
گرچہ مدت سے مروّج ہے بکھر سکتا ہے
اور ایوانوں کی مخمل پہ مچلتا ہوا جسم
ایک کٹیاں میں بھی کچھ روز ٹھہر سکتا ہے
آکہ اک عمر کی پیاس اور اندھیروں کے بعد
آج مہتاب و مئے ناب میرے ہاتھ میں ہو
زندگی تیرے اشاروں پہ بہت ناچی ہے
آکہ اب ساز کا مضراب میرے ہاتھ میں ہو
میری ٹھٹھری ہوئی آغوش میں آبا میرے
دیکھ کر تیری جوانی کے دہکتے ہوئے پھول
اپنی فاقہ زدہ روحوں میں کریں گے محسوس
ایسی وسعت جو خداؤں کا اثاثہ ہے فقط

Marfat.com

اور محلوں میں گرجتے ہوئے غصے ہونگے
اور کوچوں میں ترے نام کے چرچے ہوں گے
اور اسی شہر کے اک چھوٹے سے کمرے میں کہیں
مجھ سے لپٹے تری زلفوں کے اندھیر ہوں گے

حضراتِ گرامی! کافکا عین عالم شباب میں مر گیا۔ اُس نے اپنے والد کو جو خطوط لکھے، وہ کافکا کو زندہ جاوید کر گئے۔ ہمیں اپنے مشرقی ادب سے گلہ رہتا ہے کہ اس میں وسعت پیدا کرنے کیلئے ہمیں مغرب سے خیال اور پیرایۂ اظہار مستعار لینا پڑتا ہے۔ غلط بالکل غلط۔ سعید احمد اختر کی نظم ''شکست'' پڑھیے۔ ہر محرومِ تمنا کافکا کی کہانی ہے۔ اور آپ جتنی بار اسے پڑھتے ہیں، نئی لطافتوں اور لذتوں سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ پھر اس کی ''سانٹ'' پر نظر ڈالئے۔ روایت کا سعید احمد اختر کو کتنا شعور ہے کہ سانٹ کہنے کو تو شائد انگریزی پیراہن میں ہے لیکن اوزان اور ترنم کا دامن سعید نے کہیں بھی نہیں چھوڑا۔ اس نے اردو شاعری کے کلاسیک سانچوں کو من وعن قبول کر کے نیا لباس پہنا دیا ہے۔ اور مجموعی تخیل کافکا سے کہیں فزوں تر اور اعلیٰ۔ سعید احمد اختر کی یہ دونوں نظمیں اس قدر اعلیٰ معیار کی ہیں کہ جی چاہتا ہے یہ پوری آپ کو سنائی جائیں لیکن طوالت کے خوف سے ان نظموں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانے پر اکتفا کرتا ہوں۔

پروفیسر امین سائیکالوجی کی اعلیٰ تعلیم کیلئے جاپان گئے اور واپسی پر اپنے ساتھ ہائیکو لے آئے۔ پھر کیا تھا ہما شما لٹھ لے کر ہائیکو کے پیچھے پڑ گیا۔ حالانکہ اپنے طور پر ہائیکو کا لفظ ہی ہماری سماعتوں پر گراں گذرتا ہے۔ اور اس سے بہت پہلے لوگوں نے ثلاثیہ، دوہے، ماہئے اور سہ بیتا کہا ہے۔ کہنے کو تو سعید احمد اختر نے قطعات لکھے مگر معنی آفرینی اور گہرائی، میں ہائیکو سے کہیں بہتر اور خوبصورت شعر ہیں۔ میں ہائیکو کا ایک قطعہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں اور میرا یہ دعویٰ ہے کہ جدید ہائیکو شاعری میں آپ اس کی نظیر

Marfat.com

نہیں دکھا سکتے۔ اگر ہے تو لایئے۔ اختر کہتا ہے۔

اختر کہ زندگی کی اذیت کے ساتھ ساتھ
برسوں سے تیرے پیار کے سِل کا مریض تھا
کل مر گیا تو کہتے ہیں ''دل کا مریض تھا''

آب ذرا ایک قطعہ سنئے اور انصاف کیجئے کہ کیا ایسی زبان اور ابلاغ کی موجودگی میں کسی نامانوس اور غیر ملکی صفِ سخن کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ دراصل بقول حالی اب ادب میں عالم پیدا ہو رہے ہیں مزدور نہیں۔ سعید کہتا ہے۔

سردیاں ہیں، ہوا ہے، بارش ہے
رات ہے شہر ہے اندھیرا ہے
گاؤں کی بھولی بھالی گوری کا
رام جانے ، کہاں بسیرا ہے

شاعری اور ادب کے حوالے سے میں ایک دو واقعات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہر شخص جو اپنے نصب العین یا پیشے سے مخلص ہے اور اُسے منفعت بخش سمجھتا ہے، اپنی اولاد کو بھی اُسی راہ پر ڈالتا ہے اور یہی اصلی کمٹ منٹ ہے۔ حالانکہ فیشن کے طور پر ہم نہ جانے کہاں کہاں کمٹ منٹ کا استعمال کر کے اپنی گفتگو کو بھاری بھر کم بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سعید اختر نے خاور کو بھی شاعر بنا دیا۔ یہ کتنی بڑی کمٹ منٹ ہے۔ پچھلے دنوں بیگم سعید اختر علیل تھیں۔ میں مزاج پرسی کیلئے حاضر ہوا۔ باتوں باتوں میں میں نے کہا کہ آپ اتنی پریشان نہ رہا کریں۔ تو فرمانے لگیں کہ جہاں دو پاگل اکٹھے ہو جائیں تو وہاں پریشانی کے علاوہ کیا باقی رہ جاتا ہے۔ اس سے بڑا اخراجِ عقیدت و اعتراف اور نہیں ہو سکتا۔

پروفیسر نذیر اشک سعید احمد اختر کے دیرینہ دوست ہیں، وہ یقیناً میری بات کی

Marfat.com

تصدیق کریں گے۔سعید احمد اختر دیسی گھی جیسا سچا قہقہہ لگاتا ہے۔جب کوئی دلچسپ بات گفتگو میں آجائے تو سعید احمد اختر کی عادت ہے کہ وہ مخاطب شخص کا یا تو ہاتھ زور سے دباتا ہے ورنہ اس کا بازو پکڑ کر اسے زور سے اپنی طرف کھینچتا ہے۔پچھلے دنوں وہ اسلام آباد سے علاج کرا کے واپس آیا تو میں عیادت کیلئے گیا۔اسی طرح سے حسب عادت اس نے بلند و بانگ قہقہہ لگایا۔اونچی آواز میں مجھ سے باتیں شروع کیں۔پھر یکا یک وہ سرگوشی میں بات کرنے لگا۔معلوم ہوا کہ ڈاکٹروں نے زیادہ بولنے اور اونچی آواز میں بات کرنے سے منع کیا ہے۔اور خاور نے الٹی میٹم دیا ہے کہ دوبارہ اگر بدپرہیزی کے موجب بیمار ہو جائیں تو علاج کیلئے دریا خان جانا۔اسلام آباد نہ آنا۔تمہاری بے بسی پر اختر تمہارا ہی شعر تمہاری نذر ہے۔قبول کرو۔

تقدیر کے گنبد میں دریچہ ہے نہ در ہے
اصلاحِ قفس کیلئے آواز اٹھاؤ

حضراتِ گرامی! اب ایک آخری بات کہنا چاہتا ہوں۔میری یہ تحریر تشنۂ تکمیل ہے۔میں سعید احمد اختر کے فن پر تفصیل سے لکھنا چاہتا ہوں۔اس کی شاعری کے کئی ایسے پہلو میں جو محض طوالت کے خیال سے میں دائرۂ قلم میں نہیں لا رہا۔میں نے ''پتہ ٹوٹا ڈال سے'' پوری نہیں پڑھی۔کیونکہ سعید کا شعر وقت اور توجہ مانگتا ہے۔اب تو سعید اختر کی بے شمار کتابیں آچکی ہیں اور اُس کے فن نے اُردو سے ہندی کی طرف کامیاب مراجعت کی ہے۔

Marfat.com

میں، انوار احمد اور اُس کی خاکہ نگاری

''میرے عزیز ہموطنو'' ہو چکا تھا۔ شہر شہر بھاری بوٹوں کی دھمک سنی جا رہی تھی۔ گلی گلی میں ٹکٹکیاں نصب ہو چکی تھی جن پر باندھ کر عزت داروں کی عزت کو بلا تخصیص و تمیز کوڑوں کی سان پر چڑھانے کے مناظر عام تھے۔ جمہوریت تو ختم ہوئی، جمہوریت والوں سے مستقل چھٹکاروں کے مختلف پہلوؤں پر غور ہو رہا تھا۔ افسردگی، ملال اور اداسی کی سیاہ چادر ہر سو تنی ہوئی تھی۔ چند فرزندان وقت کے سوا خلق خدا حسرت و یاس میں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہی دن تھے جب میں ٹرانسفر ہو کر ملتان آیا۔ کرنل دلنواز کی کتاب ''داغ داغ دل'' کی تقریب رونمائی ملتان آرٹس کونسل میں منعقد ہوئی۔ میں نے اپنی معروضات پیش کیں۔ پروفیسر اے بی اشرف نے کتاب کے حوالے سے بہت عمدہ مضمون پڑھا۔ اے بی اشرف میں اک عجب سی مقناطیسیت ہے۔ وہ ایسا نندلال ہے کہ پنگھٹ پر جس پنہاری کا گاگر پھوڑے، وہ اپنی قسمت پر ناز کر اٹھتی ہے۔ اک دفعہ اس نے جس سے مسکرا کے بات کی، وہ ہمیشہ کیلئے اس کا ہو گیا۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا۔ بے شمار قتیل خواتین کی طرح میں بھی تھوڑی سی جنسی جمع تفریق کے ساتھ عمر بھر کے لئے اس کے حسن اخلاق کا شکار ہو رہا۔ اے بی اشرف اور انوار احمد اک دوجے کے سابقے اور لاحقے ہیں۔ اگر دونوں کو اکٹھا کر کے کوئی نتیجہ نکالا جائے تو اک علیحدہ اور مکمل مکتب فکر بنتا ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر ملتان کے ادب سے انہیں نکال دیا جائے تو پیچھے لا رہ جاتا ہے۔ انہی دنوں میرا انوار سے اے بی اشرف کے توسط سے تعارف ہوا جو ایک عقیدت مندانہ دوستی میں تبدیل ہوا۔ میں نے عقیدت مند دوستی اس لئے کہا کہ آج جب میں اکتیں برس

Marfat.com

پہلے کے ماہ و سال پر نظر ڈالتا ہوں تو یادوں کی سکرین پر انوار احمد کا سدا مسکراتا ہوا چہرہ مجھے سب سے زیادہ دمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ میرے تین چار سالہ قیام ملتان کو اس شخص نے یادگار بنا دیا۔ اگر چہ بہت سے مہربان چہروں نے مجھے اپنے خلوص بے پایاں کے حصار میں لے رکھا تھا مثلاً انوار اور اے بی اشرف کے علاوہ مبارک مجوکہ دوستی کی مثلث کا ایک زاویہ تھا۔ میری الوداعی تقریب میں اس نے بہت سے دوستوں کو گھر پر بلا کر اک ایسی پرتکلف دعوت دی جس کے خلوص بھرے ذائقے آج بھی کام و دہن کو شاد کرتے ہیں۔ لیکن انوار نے اس عرصے میں میرے ساتھ محبت اخلاص اور ہمدردی کی وہ انتہا کر دی جسے بیان کرنے کیلئے میرے پاس لفظ نہیں ہیں۔ ان دنوں اردو اکادمی کے ہفتہ وار اجلاس گلگشت کے ایک سکول میں ٹوٹی پھوٹی کرسیوں پر ہوا کرتے تھے۔ یہ کرسیاں اور ٹوٹی ہوئی میز آراستہ کرنا پروفیسر ڈاکٹر امین کی ذمہ داری ہوتی تھی جو اکادمی کے سدا بہار سیکرٹری تھے۔ میں سدا کا بیمار آدمی تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری جسمانی تکلیف کے پیش نظر انوار میرے آرام کا اس طرح خیال رکھتا کہ مجھے اچھی سی کرسی پر بٹھاتا۔ اور اگر مجھے ذرا سا مضطرب یا بے چین پاتا تو خود بھی بے چین ہو جاتا۔ پھر اکادمی کے اجلاس کے بعد اے بی اشرف، انوار، مجوکہ اور میں ہوٹل بازی کے لئے نکل کھڑے ہوتے۔ ہماری عمومی منزل چوک گھنٹہ گھر کے اردگرد پھیلے ہوئے وہ تھڑے دار قوابی ہوتے جہاں ہم سیخ کباب اور چکن پیس کی دعوت ہائے شیراز اڑاتے۔ یہاں بھی انوار کو میری نشست و برخاست کی فکر رہتی۔ انوار میرا ہم عمر ہے لیکن میرے ساتھ اس کا رویہ اس مادر مہربان سا رہا جو اپنے بچے پر جان چھڑکتی ہے۔ اگر چہ 67-68 میں ''کوہستان'' اور ''نوائے وقت'' کے ساتھ منسلک رہنے کے دوران میں نے کالم نگاری شروع کر دی تھی۔ لیکن وردی پہن لینے کے بعد ادب اور صحافت خواب و خیال ہو کر رہ گئے۔ پانچ چھ سال کی ذہنی اور جسمانی صعوبت کے بعد جب میرا تبادلہ بلوچستان ہوا تو کچھ ہی عرصہ بعد بھٹو مرحوم نے بلوچستان میں

Marfat.com

عمومی حالت جنگ یعنی (Insurgency) کا اعلان کر دیا۔ خفیہ ایجنسی سے متعلق ہونے کی وجہ سے میں نے پورا بلوچستان دیکھ ڈالا۔ میری پہلی کتاب ''بلوچستان...... رومانیت کے آئینے میں'' انہی دنوں کی یادگار ہے۔ شاعری میں تک بندی میں زمانہ طالب علمی سے کر رہا تھا۔ مزاجاً ایک متضاد پیشے کا انتخاب میری ساری علمی اور فکری صلاحیتوں کو سیلاب کی طرح بہا لے گیا۔ ملتان آ کر میں نے ایک دفعہ پھر قلم سنبھالا اور روزنامہ ''امروز'' میں ہفتہ وار ادبی ڈائری لکھنا شروع کر دی۔ اور شعر و ادب کی ہر اس تقریب میں شریک ہونے لگا جہاں اے بی اشرف اور انوار ہوتے چنانچہ نثر کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی حسب توفیق رواں ہو گیا۔ من آنم کہ من دانم کے مصداق مجھے اپنی ادبی صلاحیتوں کے بارے میں کوئی خوش فہمی یا حسن ظن نہیں رہا۔ لیکن انوار نے میری بہت دلجوئی کی۔ میرا حوصلہ بڑھایا۔ میری تمام تر قلمی خامیوں کو نظر انداز کر کے ہمیشہ میرے کالموں اور میری شاعری کی تعریف کی۔ رہی سہی کسر اے بے اشرف اور مبارک مجوکہ پوری کر دیتے تھے۔ یوں وردی کے ساتھ منسلک میرے دکھوں کا مداوا اس طرح ہوا کہ پلک جھپکتے چار سال گذر گئے اور میرا تبادلہ آ گیا۔ اے بی اشرف نے ''امروز'' میں مجھے پر ایک کالم لکھا۔ وہ تحریر آج بھی میرے پاس محفوظ ہے اور میرے لئے سرمایۂ اعزاز ہے۔ انوار احمد ان دنوں کبھی کبھار ''خامہ بگوش'' کی طرح ''امروز'' میں بڑے مزے کے اور چبھتے ہوئے کالم لکھا کرتا تھا۔ عنوان ہوتا تھا ''اڑان لفظوں کی''۔ شائد یہ محبت اور عقیدت کا اعجاز تھا کہ میں نے اپنی دوسری کتاب کا عنوان ہی ''اڑان لفظوں کی'' رکھا اور انوار سے اجازت بھی نہ لی۔ اے بی اشرف اور انوار سے دوستی کے آغاز میں ہی ایک دلچسپ لطیفہ ہوا۔ عرش صدیقی مرحوم سے تعارف بھی انوار کے طفیل ہوا تھا۔ عرش صدیقی نئے نئے رجسٹرار ہوئے تھے۔ کسی بدگمان نے صدیقی صاحب کے کان میں یہ بات ڈال دی کہ ''فوج کا یہ افسر جس سے آپ ملتے رہتے ہیں دراصل خفیہ ایجنسی کی طرف سے ترقی

Marfat.com

پسندوں کی سرگرمیوں کی رپورٹنگ کیلئے تعینات کیا گیا ہے۔ اسے کوئی لکھ لکھ کر دیتا ہے اور یہ ادبی محفلوں میں پڑھ دیتا ہے اس سے محتاط رہنا'' عرش صدیقی کی گھگی بندھ گئی۔ انہوں نے اے بی اشرف اور انوار احمد کو دفتر میں بلایا اور اپنی ''مصدقہ اطلاع'' کی روشنی میں مجھ سے فاصلہ رکھنے کی تلقین کی۔ اسی شام انوار نے مجھے اس سرکاری انتباہ سے آگاہ کیا اور نتیجتاً ہماری ملاقاتوں کا تواتر اور بڑھ گیا۔ لیکن عرش صاحب تمام عرصہ مجھ سے کھچے کھچے اور کشاں کشاں رہے۔ مرحوم کو کیا پتہ تھا کہ میں تو ''سرخوں'' کی رپورٹنگ نہ کر سکا البتہ ''سفید پارچات'' والوں نے میری رپورٹنگ کر ڈالی۔ میری فائل کھل گئی اور پھر آئے دن اُس کے حجم میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اصغر ندیم سید کی کتاب ''زمین زاد کا افق'' کی تقریب بڑے اہتمام سے منعقد ہوئی۔ لاہور سے مُنّو بھائی اور کشور ناہید کو بلوایا گیا۔ شعبہ اردو کے طلباء و طالبات سے کشور ناہید نے خطاب کیا۔ پہلی صف میں سامعین میں عاجز بھی وردی میں شریک تھا۔ ایجنسی والوں نے تصویر بڑی کروا کے میرے ہیڈ کوارٹر بھجوا دی۔ میری پیشی ہوئی میرا پچھلا سارا ریکارڈ پھیلا کر میرے سامنے رکھ دیا گیا اور مجھے سرکاری وارننگ مل گئی۔ میری فائل کا حجم بڑھ گیا۔ ترقی کے راستے میں ہر سنگ میل پر یہ فائل میرا راستہ روکتی رہی اور میں ایک چھوٹے رینک سے ریٹائر ہو کر گھر آ گیا لیکن الحمدللہ اس نازک وقت میں اور آج بھی مجھے اشرف، انوار اور مجوکہ کی دوستی پر ناز ہے۔ میں 81ء کے آغاز میں تبدیل ہو کر جہلم چلا گیا۔ میرے پیچھے انوار پر ہوائی جہاز ہائی جیک کرنے کا مقدمہ بن گیا۔ سوچتا ہوں کہ انوار تو سیولین تھا۔ چھپتا چھپاتا کسی طرح اپنی جان بچا نکلا۔ اگر میں ملتان میں ہوتا تو یقیناً انوار کی دوستی میں میرا کورٹ مارشل ہو جاتا اور میں سنٹرل جیل میں پہنچ جاتا۔

میں نے ایک دفعہ انوار سے اردو میں ایم اے کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے دیر نہیں کی۔ پہلے میرا رجسٹریشن کارڈ لے آیا۔ پھر تمام مضامین کے نوٹس بذات خود

Marfat.com

پہنچا گیا۔ میرا داخلہ جمع کرایا اور مجھے رول نمبر سلپ پکڑا گیا۔ آج کے دور میں ایسے اخلاص، ہمدردی اور دوست نوازی کا تصور بھی محال ہے۔ میری ایم اے اُردو کی تیاری زوروں پر تھی کہ اچانک ایک ایسی جنگی مشق درمیان میں آ گئی جس میں میری یونٹ نے حصہ لینا تھا اور یوں میری تیاری دھری کی دھری رہ گئی۔ دوسری مرتبہ بلوچستان تعینات ہونے پر میں نے یہ شوق پورا کیا۔ میرے قیام ملتان کے زمانے میں ہم دوست کبھی کبھار اپنے گھروں پر کھانے کا اہتمام کر لیتے تھے۔ انوار نے نہ تو کبھی جھوٹے منہ سے مجھے گھر آنے کا ''ست'' کیا اور نہ کبھی گھر پر کھانا کھلانے کا تردد کیا۔ مجھے اس کا یہ کٹھور پن بڑا کھلتا تھا۔ جب دوسرے دوستوں سے گلہ کیا تو مجھ پر کھلا کہ انوار نے پہلے عشق فرمایا اور پھر اسی عشوہ گر سے شادی کی بھیانک غلطی کر بیٹھا۔ اس غلطی کا خمیازہ وہ آج تک بھگت رہا ہے۔ معشوق سے شادی کرنے والے مردوں کا یہ المیہ ہے کہ وہ ساری عمر جوتی صاف کر کے بیویوں کو پیش کرتے رہتے ہیں اور بیویاں صوابدیدی اختیارات کے تحت آزادانہ استعمال کرتی رہتی ہیں۔ اصغر ندیم سید نے ایک طویل مدت کے بعد انوار کو اپنی محبوبہ (ف نمبر 2) سے شادی کرنے کا مشورہ دیا۔ جواب میں انوار نے اُسے لکھا ''............ایک تو یہ فیصلہ کرنے میں تم نے 35 برس لگا دیئے۔ دوسرے اس خاتون کی آخر کار 10 برس پہلے شادی ہو گئی ہے۔ تیسرے میری شادی 36 برس پہلے ہوئی تھی اور میری بیوی مجھے رنڈوا ہونے کا اعزاز بخشنے کی بجائے بیوہ ہونا زیادہ پسند کرے گی''۔

2006ء میں میں ملتان گیا۔ انوار کی ریٹائرمنٹ قریب تھی۔ مگر وہ اتنا کام کر رہا تھا کہ اسے سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی۔ وہ یونیورسٹی چھوڑنے سے پہلے بہت سے کام کرنے کا خواہش مند تھا۔ وہ مجھے سرائیکی سنٹر لے گیا، جہاں اپنی نگرانی میں اس نے سرائیکی ادب پر بے تحاشا کام کرایا۔ چن چن کے محنتی لوگوں کو سنٹر میں لایا۔ جہاں انہوں نے دن رات محنت اور تحقیق سے سرائیکی ادب میں بے بہا اضافہ کیا۔ اس ادارے نے

Marfat.com

تھوڑے ہی عرصے میں سرائیکی کو عالمی پلیٹ فارم کے شایاں آواز عطا کی ہے۔ انوار بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی سے چلا گیا ہے لیکن جن علمی وتحقیقاتی روایات کی بنیادیں اس نے رکھی ہیں، ان کی وجہ سے اس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ انوار بڑا مسرور اور خوش تھا۔ اس نے مجھے سرائیکی سنٹر سے شائع ہونے والی کتابوں کا تحفہ بھی دیا جو میری ذاتی لائبریری میں گرانقدر اضافہ ہے۔

انوار احمد 'سیاسی بڑبڑیا'' ہے۔ وہ ہر وقت سیاسی بڑبڑاہٹ اور گفت لا حاصل (Loose Tak) میں لگا رہتا ہے۔ وہ Down to earth قسم کا ڈائی ہارڈ پیپلیا ہے اور انتہا کا متحرک (Activist) ہے۔ اس کی یہی کھلی سیاسی گفتگو مصائب کو دعوت دیتی رہتی ہے۔ اس کی سیاسی نفسیات ایک ریڑھی والے کی طرح سراب کا تعاقب کرتی ہے۔ اس نے یا تو سماج کے مختلف فکری نظاموں کا مطالعہ نہیں کیا اور یا پھر ان سے متاثر نہیں ہوا۔ وہ بس ''آوے ای آوے اور جاوے ای جاوے'' کے نعرے لگانے میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ اپنے دوسرے ہمعصروں کے ساتھ اکثر جانباز جیالوں کی طرح الجھ پڑتا ہے۔ لیکن اس نے مجھے کبھی ''لفٹ' نہیں کروائی۔ وہ مجھے ''نا قابل اصلاح'' سمجھتا رہا۔ اور اس کی بھی وجوہات ہیں۔ میں قبیلۂ صالحین میں پیدا ہوا۔ میری تعلیم وتربیت نرغۂ صالحین میں ہوئی۔ لیکن جب میں نے یونیفارم پہن لی تو اک نئے نظام زندگی میں آ گیا اور پہلے فلسفۂ حیات کا چغہ اتار پھینکا۔ پھر بھی اک طویل عرصے تک پرانے فلسفے کی فکری بازگشت میرا پیچھا کرتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ہیروئن اور کلاشنکوف کی درآمد، قتل جمہوریت اور بنیادی انسانی حقوق کی پامالی جیسے مجرمانہ اقدامات کو یکسر نظر انداز کر کے میں ضیاءالحق کو اس کارنامے پر خراجِ تحسین پیش کرتا تھا کہ اس نے جنرل اسمبلی میں پہلی دفعہ تلاوت قرآن کرادی تھی۔ میں نا قابل اصلاح تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ آہستہ آہستہ مطالعے اور مشاہدے نے مجھ پر سوچ سمجھ کی راہیں کھولیں اور میں کھوٹے کھرے میں تمیز کرنے

Marfat.com

کے قابل ہوا۔لیکن اس وقت تک میں اپنے روشن دماغ دوستوں سے بچھڑ چکا تھا۔

کسی بڑے ریلوے سٹیشن پر جب کوئی بڑی ٹرین آتی ہے تو کیا منظر ہوتا ہے۔ آوازوں اور انسانوں کا اک سمندر ہلکورے لے رہا ہوتا ہے۔سوار ہونے والوں، اترنے والوں، الوداع کہنے والوں، استقبال کرنے والوں اور خوانچہ فروشوں کا اک جم غفیر ہوتا ہے جو مصروف چیونٹیوں کی طرح ادھر سے اُدھر مسلسل اضطراب میں نظر آتا ہے۔اتنا شور ہوتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ بھانت بھانت کی اتنی بولیاں ہوتی ہیں کہ آواز اک بے ہنگم شور میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔اگر ایسے میں کوئی شخص اس طرح اک منفرد آواز بلند کرتا ہے کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں تو یہ اس شخص کا کمال ہے۔اردو ادب کے آوازوں بھرے جنگل میں اپنی آواز کو منفرد رکھنے کا ہنر انوار احمد خوب جانتا ہے۔اُردو نثر و شعر میں اس قدر سرعت کے ساتھ ہمہ جہتی تجربے ہو رہے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ناقد یا محقق کسی ایک تجربے کے رطب و یابس پر قلم اٹھانے لگتا ہے کہ موسم بدل جاتا ہے اور زبان و بیان کا کوئی نیا تجربہ قبول عام کی سند پالیتا ہے۔ایسے میں ریلوے پلیٹ فارم پر آواز لگانے والے کامیاب شخص کی طرح کوئی ایک آواز ہوتی ہے جو اپنے قاری کی توجہ کھینچنے میں کامیاب و سرخرو ہو پاتی ہے۔انوار نے اپنی ہر تخلیق میں اپنی آواز کو ارد گرد کی دیگر آوازوں سے ممیز رکھا اور مجھ جیسے کاہل شخص کو بھی پوری کتاب پڑھ لینے پر مجبور کیا۔ بنیادی طور پر وہ تحقیق اور افسانے کا آدمی ہے۔اس کے کئی افسانوی مجموعے اور تحقیق پر بہت ساری کتابیں قاری سے داد تحسین پا چکی ہیں۔گذشتہ دنوں قلمی خاکوں پر مشتمل اس کی کتاب ''یادگار زمانہ ہیں جو لوگ'' چھپی ہے۔میں بلا خوف تردید یہ دعویٰ کر رہا ہوں کہ انوار کے یہ خاکے رجحان ساز (Trend Setter) ثابت ہوں گے۔

''چند اپنی باتیں'' میں مصنف نے قی الحال بوجوہ اپنی آپ بیتی نہ لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔مگر یہ کیسی مہارت ہے کہ وہ اپنے ہر کردار کے ساتھ قطار میں کھڑے ہو کر

Marfat.com

قاری سے مصافحہ کرتا ہے اور اپنی داستان حیات کا کچھ حصہ بڑے آرام سے سنا جاتا ہے۔
اُس نے چوبیس شخصیات کے خاکے لکھے لیکن میری ایماندارانہ رائے یہ ہے کہ کسی ایک خاکے میں سے انوار کی ذات کو نکال دیا جائے تو خاکے کے سارے رنگ پھیکے پڑ جاتے ہیں۔ دراصل یہ انوار کی آپ بیتی ہے۔ بچپن کی محرومیاں، عسرت، تنگدستی اور غربت کی تفصیلات بتاتے ہوئے انوار کا قلم کہیں بھی نہیں لڑکھڑایا۔ انوار نے نوے فیصد کردار ایسے چنے جو اس کی اپنی شخصیت کے اردگرد آباد ہیں۔ اس نے جہاں بے تکلف دوستوں کے خاکے اڑائے ہیں، وہاں اپنی زندگی کے جہری و خفی پردوں کو چاک کرنے میں بھی دیر نہیں لگائی۔ یہی اس کی تحریر کا حسن ہے۔ انوار آج ایک متمول ماہر تعلیم ہے۔ کوٹھی بنگلہ کار اور نوکر چاکر سب کچھ اس کے پاس ہے۔ ڈیڑھ مرلے کے ایک بوسیدہ سے گھر میں رہنے والا ایک چار سالہ یتیم بچہ شائد مذکورہ تعیشات کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ انوار چاہتا تو کئی کمزور حقائق کو گول کر جاتا۔ لیکن وہ وقت کا ایاز ہے۔ اسے اپنے ماضی کے چرواہے والی گدڑی نہیں بھولی۔ جونہی کسی کردار کا کوئی جذباتی پہلو اس کے نوک قلم پر آتا ہے، پورے کا پورا انوار بے ساختہ اندر آجاتا ہے۔ اس طرح میرے تجزیئے کے مطابق انوار کے یہ خاکے ایک نیا تجربہ ہے۔ میں انوار کے ان سارے کرداروں سے کماحقہٗ واقف ہوں اور پڑھنے کے دوران یہ سب کردار باری باری میرے پردۂ ذہن پر اپنی پوری جزئیات کے ساتھ جلوہ فگن رہے۔ انوار نے اپنی تحریر میں کوئی ادبی طوطے مینا بٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ اک بے ساختہ بیانیہ ہے جو آنکھوں کے راستے دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ کتاب پڑھتے ہوئے انوار کا شرارت بھرا انداز قاری کی انگلی تھامے اسے اپنے ساتھ لے چلتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ انوار نے یہ کتاب نہیں لکھی بلکہ دوستوں کی محفل میں بیٹھ کر دوستوں کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ اس کی عبارت قہقہہ بار ہے اور اس میں اک گنگناتی اور اچھلتی کودتی ندی جیسی روانی ہے۔ میں نے انوار کے وہ خاکے بار بار پڑھے ہیں جن میں اس کی

Marfat.com

جولانی طبع کا جوبن اور جملوں کی کاٹ عروج پر ہے۔ انوار کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بندہ ضائع کر دیتا ہے مگر جملہ ضائع نہیں ہونے دیتا۔ ہاں اس نے جب اپنے اساتذہ اور محترم ہستیوں کا ذکر کیا ہے تو تقدس کے ایک ہالے نے اس کے قلم کو اپنے حصار میں لے لیا۔ یہاں انوار سر پر سفید ٹوپی پہن کر دوزانو ہو کر آنکھیں نیچی کر کے اور ہاتھ باندھ کر محفل میں بیٹھتا ہے۔ ایک مختلف اور سعادت مند شاگرد۔ ان خاکوں میں اگرچہ زور بیان کا معیار برقرار ہے مگر انوار کی مخصوص ڈکشن یقیناً متاثر ہوئی ہے۔ قریبی دوستوں کے خاکوں میں انوار کے بعض جملے سونے کے پانی سے لکھنے کے قابل ہیں۔ ان میں سے چند جملے قندِ مکرّر کے طور پر لکھ رہا ہوں۔ اے بی اشرف کے خاکے میں انوار لکھتا ہے۔

''......وہ کسی بھی خاتون کا دل توڑنا گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں۔ کسی بھی بڑے شخص کی پہلی بیوی تک کو کہہ دیتے ہیں۔ ''قسم سے میں نے تو آپ کو ان صاحب کی بیٹی سمجھا تھا۔'' اس اسم اعظم کے طفیل ان پر بڑے طاقتوروں کے گھر کا دروازہ پہلے کھلتا تھا اور کتا بعد میں''۔ اصغر ندیم سید کے خاکے میں لکھتا ہے۔

''مارچ 1981ء میں جب پی آئی اے کا طیارہ اغواہ ہوا تو ملتان سے مجھ سمیت اسے پروفیسروں کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے، جنہوں نے اس وقت تک ہوائی اڈا بھی اندر سے دیکھا ہوا نہیں تھا'' پھر کہتا ہے۔

''چند حاسد قسم کے دوستوں نے انگریزی میں اس (اصغر ندیم سید) کی استعداد پر شک وشبہ کا اظہار کیا۔ وہ شائد نہیں جانتے کہ اصغر بہت سارے گریجوٹیوں سے زیادہ انگریزی جانتا ہے کیونکہ اس نے بی اے میں انگریزی دو دفعہ پڑھی ہے''...... ایک جگہ انوار لکھتا ہے''۔ ایک مرتبہ میرے سامنے بڑے شاہ جی نے جب اصغر کی دھنائی نما کھنچائی کی تو اس نے کراہ کر کہا بابا میں نے انوار پر سدا رشک کیا ہے یہ بچپن میں ہی باپ کے سائے سے محروم ہو گیا تھا...... اس پر تقصیر دنیا کے ساتھ ساتھ بڑے شاہ جی

Marfat.com

روحانیت پر بھی متصرف تھے۔ میں بڑی بے یقینی کے ساتھ ان کے دعوے سنا کرتا تھا۔ آخری دنوں میں کہا کرتے تھے۔ کہ میں نے اپنے سارے روحانی فیوض وکمالات اپنے اصغر کو منتقل کر دیئے ہیں۔ میں نے اصغر سے کبھی تصدیق نہیں کی مگر رات دس بجے کے بعد اس پر رقت وعرفان کی ایسی کیفیت ضرور دیکھی ہے جو مجلس عزا میں بھی اس پر طاری نہیں ہوتی۔ البتہ ایسی حالت تک جانے کیلئے ایک آدھ ہم مشروب کی ضرورت ہوتی ہے''۔ ایسے خوبصورت بیانیہ جملوں کا اک قطار اندر قطار سلسلہ ہے جو بے تکلیف دوستوں کے خاکوں میں بڑی کثرت سے ملتا ہے۔ البتہ اس بات کی بڑی حیرانگی ہے کہ مبارک مجوکہ کس طرح اس سفاک قلمکار کے ٹوکے سے بچ نکلا۔

عبدالرؤف شیخ ایک اکل کھرّا جاٹ اور کٹھ ملا قسم کا ہٹ دھرم لیکن سیدھا سادہ اُستاد تھا۔ دنیاداری، ابن الوقتی اور مصلحت کوشی اس کے قریب سے نہیں گذری تھی۔ زبان کا بدلحاظ مگر دل کا انتہائی صاف شخص تھا۔ انوار کے ساتھ اس نے بھی بُرا وقت آنکھوں میں کاٹا تھا۔ اسے یونیورسٹی کے اس مقام تک لانے میں انوار کا بڑا عمل دخل تھا۔ رؤف نے بدلحاظی کا ایک مظاہرہ کیا۔ انوار نے محض خدا ترسی اور انسانی جذبے کے تحت اپنے ایک پرچے میں کسی لڑکی کے حاصل شدہ نمبروں میں بعدازاں کچھ نمبروں کا اضافہ کر کے اُسے فائدہ پہنچایا۔ راؤف شیخ نے اسے انوار کی پیشہ ورانہ بدیانتی قرار دے کر ''اوپر'' نوٹنگ کر دی۔ جس سے انوار کو بعد میں دشواریوں کا سامنا رہا۔ اس کا بدلہ انوار نے اپنا پورا اثرورسوخ استعمال کر کے نہ صرف رؤف کو صدر شعبہ کے عہدے سے محروم کر کے لیا۔ بلکہ ایسی فضا بھی تخلیق کر ڈالی کہ یونیورسٹی اُسے اپنے ابتدائی ادارے گورنمنٹ کالج بھکر واپس بھیجنے پر تیار ہوگئی۔ جو کچھ رؤف شیخ نے انوار احمد سے کیا، وہ اس کی افتادِ طبع کے پیش نظر متوقع تھا۔ لیکن جو کچھ انوار نے شیخ سے کر ڈالا، وہ انوار کی خصلت اور فطرت کے خلاف تھا۔ یونیورسٹی کی سطح پر تدریس کے دوران مجھے یہ تجربہ حاصل ہوا۔ کہ کچھ شاگرد

Marfat.com

اساتذہ کے منظورِ نظر ہو جاتے ہیں اور ایسے شاگردوں کیلئے اساتذہ کے دل میں نرم گوشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ میرے قیام ملتان کے دوران روبینہ ترین شعبۂ اردو کی لائق طالبہ تھیں۔ بدیں وجہ وہ اے بی اشرف اور انوار کی منظورِ نظر بھی تھیں۔ بلکہ اے بی اشرف نے اپنی ایک کتاب کا انتساب بھی روبینہ کے نام کیا تھا۔ ملتان کے بعض خواہ حلقوں نے میرے دوستوں پر بڑا کیچڑ بھی اچھالا تھا۔ ممکن ہے کہ پسندیدگی کا وہی پرانا سلسلہ کارفرما ہو کہ روبینہ ترین کو صدرِ شعبہ بنانے کیلئے انوار نے رؤف شیخ کو ہٹانے کا تہیہ کرلیا ہو لیکن یہ میرے اپنے قیافے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس ساری صورت حال کے پیچھے محکمانہ کارروائی کا اپنا اک نظام ہو اور انوار کا کہیں بھی کوئی بھی قصور نہ ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔ بہرحال جس شخص نے کلرکی کر کے اپنی پہلی آدھی تنخواہ اپنے بیروزگار دوست انوار احمد کو کراچی سے بھجوادی ہو، وہ اس برے سلوک کا مستحق نہیں تھا۔ تبھی تو مرحوم نے صلح کی پیشکش پر انوار کو کہلا بھیجا کہ اب ہماری قبریں بھی اکٹھی نہیں ہوں گی۔

جب ضیاء الحق کی طویل آمریت کا دور ختم ہوا اور بےنظیر مرحومہ حکومت میں آئیں تو دور نزدیک سے جیالوں کی اسلام آباد مراجعت شروع ہوئی۔ بغل میں اخباری تراشوں اور اپنی کوڑے کھاتی تصویروں کی فائلیں اٹھائے یہ جیالے سرکار دربار تک رسائی میں کوشاں نظر آتے۔ ان میں سے اکثر اپنی مرادیں پاتے۔ ایک وکیل کو میرے سامنے گومل یونیورسٹی کا وائس چانسلر لگا دیا گیا۔ جب میں نے "بےنظیر بھٹو سے خلق خدا کا انمٹ لگاؤ" پڑھا تو مجھے ایسے لگا کہ انوار احمد بغل میں اپنی کارکردگی کی فائل دبا کر اسلام آباد پہنچ گیا ہے۔ مجھ جیسا عقیدت مند دوست تو شائد کبھی تصور میں بھی نہ سوچ سکے کہ یہ بے محل مضمون انوار احمد نے کسی ذاتی منفعت کی خاطر خوبصورت ادبی خاکوں میں گھسیڑ دیا ہے مگر اتنے اچھے خاکے پڑھتے پڑھتے جب ایک قاری اس قدکشی کی دانستہ کوشش پر پہنچتا ہے تو انوار احمد کی خوبصورت شخصیت کا گراف چھناکے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ

Marfat.com

خاکہ کسی طور بھی نہیں بنتا بلکہ اک ایسا سیاسی مضمون ہے جس میں انوار نے بے نظیر سے اپنے تعلق کو پروجیکٹ کیا ہے۔ اسی لئے قاری محسوس کرنے لگتا ہے کہ عنقریب انوار احمد کو بڑی کرسی ملنے والی ہے۔ سلیم جان وکیل تھا۔ حسن کارکردگی دکھا کر گومل یونیورسٹی کا وائس چانسلر بن گیا۔ انوار تو اک ماہر تعلیم اور سابقہ ڈین ہے۔ اس کے علاوہ وہ تمغہ حسن کارکردگی کا حامل ہے۔ بے نظیر مرحومہ نے اس سے پاکستان کی تعلیمی پالیسی پر تبادلہ خیال بھی کیا۔ وہاں یوسف رضا گیلانی بھی تھے۔ خدا انوار احمد کی عمر بھر کی کمائی ہوئی انا اور خودداری کو نظر بد سے بچائے......آمین

Marfat.com

''اہل قلم کے خطوط''......ایک جائزہ، ایک تاثر

ساس اور بہو کا جھگڑا ایک ایسا تنازع ہے جو ازل سے چلا آ رہا ہے اور آج تک اس کا کوئی تصفیہ نہیں ہو سکا۔ ہاں وہاں آ کر بہو کا سماجی پلڑہ کچھ بھاری ہو جاتا ہے جب کہہ دیا جاتا ہے کہ ساس اپنی بیٹی کے لئے دنیا کے سارے سکھ سمیٹ لینے کی خواہش کرتی ہے لیکن جب کسی اور کی بیٹی کو بیاہ کر گھر لاتی ہے تو بہو کو سکھ کا سانس لینے کی بھی اجازت نہیں دیتی خوبصورت کماؤ مگر بیوی کا غلام داماد، اکیلا گھر، نہ ساس، نند اور نہ جیٹھ دیور اور آنے جانے کی آزادی، یہ ہے اک ساس کا خواب اپنی بیٹی کیلئے۔ لیکن بہو، ہو تو اللہ تعالیٰ کی گائے، ساس اور نندوں کی خدمت گذار۔ ایسا ہی ایک جھگڑا علمی و ادبی محاذ پر بھی سدا سے چلا آ رہا ہے مصنف اور پبلشر کا جھگڑا۔ کتنے ہی الزامات ہیں جو کسی متاثرہ شاعر، ادیب اور دانشور کی طرف سے اپنے اس ناشر اور پبلشر پر لگائے جاتے ہیں جس نے اس کی کتاب شائع کی ہو۔ کتاب کے صوتی و معنوی نقائص سے لے کر اشاعت میں ناقابلِ برداشت تاخیر، تعدادِ اشاعت میں ڈنڈی، رائیلٹی میں کمی بیشی، کتابوں کی محررّہ فراہمی میں بددیانتی اور پبلشر کی خست و کنجوسی ایسے موضوعات ہیں جن پر ''مظلوم'' ادیب گھنٹوں کے حساب سے بول سکتا ہے اور کاغذوں کے تختے سیاہ کر سکتا ہے۔ نجی محفل ہو یا کوئی ادبی پلیٹ فارم، متاثرہ ادیب کی گریہ وزاری دِل شگاف ہوتی ہے۔ (اس گریہ وزاری کا اک عرصے تک میں بھی مریض رہا ہوں۔ جب کوئٹہ کے ایک ناشر نے میری پانچ سو پچاس صفحے کی کتاب کو تین کتابیں بنا کر شائع کر دیا۔ جب میں نے فریاد کی تو انہوں نے کہا کہ مصنف صاحب آپ کو میرا شکر گذار ہونا چاہئے۔ آپ ایک کتاب کے

Marfat.com

مصنف بننا چاہتے تھے اور میں نے آپ کو تین کتابوں کا مصنف بنا دیا۔ پتہ چلا کہ انہوں نے اپنے تعلقات کی بناء پر بلوچستان کی یونیورسٹی اور تمام تعلیمی اداروں اور سرکاری شعبوں کو وہ کتابیں بیچ کر بڑا مال کمایا اور مصنف کو مبلغ ساٹھ کتابوں کا اک بنڈل)۔ لیکن ہم لوگ انصاف نہیں کرتے۔ تصویر کا ایک ہی رخ ہمارے سامنے رہتا ہے۔ اور اسی وجہ سے ''مظلوم'' مصنف رائے عامہ کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

آج تک کسی ناشر یا پبلشر کی طرف الزامات کا جواب مبسوط طرح سے سامنے نہیں آیا جس میں الزامات کی نفی کر کے اصلی صورتِ حال کا شافی احاطہ کیا گیا ہو۔ پبلشر اور ناشر کی حالت ہماری زبان بند فوج جیسی ہے۔ فوج پر کیسے کیسے الزامات لگتے ہیں۔ سیاستدان دانشور اور اہل رائے حضرات دلائل و براہان کی ننگی تلواریں لے کر گونگی فوج پر پل پڑتے ہیں۔ مگر باسٹھ تریسٹھ سال میں تعلقات عامہ کا شعبہ رکھنے کے باوجود فوج نے اپنی صفائی میں کبھی قدم نہیں اٹھایا۔ پبلشرز اور ناشرز کے گنگ رہنے کی دو تین وجوہات ہو سکتی ہیں۔ اولاً لکھنے پڑھنے اور اظہار و ابلاغ سے یہ حضرات دور بھاگتے ہیں۔ جواب دینے پر اپنے خلاف ادبی محاذ کھلنے سے گھبراتے ہیں۔ ثانیاً ''متاثرین'' کی باتیں حق اور سچ ہوتی ہیں اور حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اور ثالثاً وہ دانشوروں کی آہ و فغاں کے عادی ہو جاتے ہیں۔ انہیں علم ہوتا ہے کہ اس نوحہ خواں نے اک دن پھر ان کے پاس آنا ہے...... ملک مقبول احمد بڑے ذہین و فطین ناشر اور صاحبِ دماغ صاحبِ قلم ہیں۔ انہوں نے ناشر اور ادیب کے اس ازلی جھگڑے کی بڑی دانشورانہ وضاحت کی ہے اور غیر محسوس انداز میں تصویر کے دوسرے رخ کی چند جھلکیاں بھی پیش کی ہیں۔

''اہل قلم کے خطوط'' تقریباً ایک سو پینتیس مشاہیر ادب کے خطوط پر مشتمل پانچ سو ستاسٹھ صفحات کی ایک ایسی کتاب ہے جس میں انتہائی نامور اور جانے پہچانے اہل قلم ہیں تو بے نام اور گمنام لوگ بھی ہیں۔ ملک مقبول صاحب کی یہ کتاب شور مچاتی اور

Marfat.com

واویلا کرتی ادیبوں کی آوازوں کو ایک مسکت جواب بھی ہے۔ یہ وہ کارنامہ ہے جو اس قدر مہذب انداز میں آج تک کوئی ناشر انجام نہیں دے سکا۔ ملک صاحب نے اس روائتی جھگڑے کی مستند اور مدلل تاریخ کو اک نیا چہرہ دے دیا ہے جو ادیب اور ناشر کے درمیان اک مدت سے چلا آرہا ہے۔ پیش لفظ کی چند سطروں کے سوا ملک صاحب اتنی ضخیم کتاب میں ذاتی رائے کا جھنڈا اٹھائے کہیں بھی نظر نہیں آتے۔ مجھے سعادت حسن منٹو کا وہ بیان یاد آرہا ہے جو انہوں نے اپنے خلاف قائم فحش نگاری کے کسی مقدمے میں عدالت میں دیا تھا جس کا مفہوم کچھ ایسا تھا ''میری مثال اُس خاکروب کی سی ہے جو لوگوں کی اپنی گندگی اٹھا کر ان کے پاس سے گذرتا ہے تو وہ ناک پر رومال رکھ لیتے ہیں۔ میں اسی معاشرے کی تصویریں من وعن جب لوگوں کو دکھاتا ہوں تو وہ مجھ سے نفرت کرنے لگتے ہیں''۔ تھوڑی سی قطع و برید اور جمع تفریق کے ساتھ ملک مقبول صاحب بھی خود کچھ نہیں بولے۔ مشاہیر ادب اپنے ذاتی رویوں میں جو کچھ ہیں۔ انہی کی تحریروں سے اپنے قاری کے سامنے ان کو لا کھڑا کیا ہے۔ اور اس طرح گویا ملک صاحب نے شور مچاتے لوگوں کے سامنے یہ شعر پڑھ دیا ہے۔

آپ ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکائت ہوگی

ملک مقبول صاحب نے دیباچے میں ادیبوں کے روّیوں کو ''فطری شان'' قرار دیا ہے۔ آیئے اس فطری شان کے حوالے سے ماضی میں چلتے ہیں۔ مرزا غالب اُردو ادب کا بہت بڑا نام ہے۔ خوشہ چینوں اور تجزیہ کاروں نے غالب کو دوہری شخصیت کا دانشور قرار دیا ہے۔ ایک وہ غالب جو ایک شاندار پنڈال میں کھڑا ایک بڑے مجمعے کے سامنے زرق برق لباس زیب تن کئے اپنے شعر سنا رہا ہے۔ شوکتِ لفظ روائت شکنی، مشکل تراکیب کا خوبصورت استعمال اور نازک خیال آرائی۔ اردگرد کے حالات سے بے

Marfat.com

خبر نواب نوشہ نیر وجیسی بنسری بجاتا نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں غمِ ذات اور فلسفۂ حیات و ممات کے مضامین بھی نظر آتے ہیں۔ مگر یہی غالب جب مکتوبات پر اُترتا ہے تو اس کا قلم خون کے آنسو بہاتا ہوا ملتا ہے۔ اس نے اپنے اردگرد خون میں ڈوبی ہوئی کائنات کے جزئیات کا نوحہ لکھا ہے۔ خطوط میں اک اور ہی غالب ہے جو بین کرتا ہے اور لٹی پٹی دلی کی دردناک تصویر کشی کرتا ہے۔ اور دراصل یہی غالب کی ''فطری شان'' ہے۔ میرا ذاتی تجزیہ یہ ہے کہ اگر غالب کو یہ علم ہوتا کہ اس کے مکتوبات ایک دن ایک بڑا ادبی سرمایہ بن جائیں گے تو شائد اس کے ہاں وہ بے تکلف اور بیساختہ ماحول نہ بن سکتا جو آج اِن مکتوبات کو اک ممتاز مقام دے رہا ہے۔ غالب ایک اونچے پلیٹ فارم سے مکتوب الیہ سے مخاطب ہوتا۔ ہر فقرے میں بنت کی اک شعوری کوشش نظر آتی اور غالب پھر وہی مشکل پسند، انائیت پرست اور محبوب کے دامن کو حریفانہ کھینچنے کا دعویٰ دار بن بیٹھتا۔ تشکیک و بے اعتباری کے سارے اسلوب خطوط میں ملتے۔ ملک صاحب نے چپکے چپکے اور چوری چوری معروف اہلِ قلم دانشوروں کو ڈسکور (Discover) کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اِن فاضل حضرات نے ملک مقبول صاحب کو خط لکھتے وقت یہ تصور میں بھی نہیں سوچا ہوگا، کہ یہ خط ایک دن اشاعتِ عام سے آراستہ ہو کر ادبی تاریخ کا حصہ بن جائیں گے۔ جیسے مجھے اپنے دو انتہائی ذاتی قسم کے مکتوب دیکھ کر اچنبا ہوا اور ''رنگے ہاتھوں پکڑے جانے'' کا شرمندہ سا احساس ہوا۔ بڑے ناموں میں تو اپنے اِن مکتوبات کو دیکھ کر کھلبلی سی مچ گئی ہوگی۔ اور مجھے یقین ہے کہ سنگ زنی کی بارش سے بچنے کیلئے ملک صاحب نے مستعد انتظامات بھی کر رکھے ہوں گے۔

عمومی طور پر ناشر ایک انتہائی معروف شخص ہوتا ہے۔ اس کی دُکان مسودوں ، کچی تحریروں، کمپوز شدہ (کتابت شدہ) مسودوں وغیرہ سے اس طرح اٹی پڑی ہوتی ہے کہ اگر ناشر کو ان کاغذوں میں سے کچھ ڈھونڈنا پڑے تو اک عام ناظر پریشان ہو جاتا ہے

Marfat.com

کہ وہ کس طرح سے مطلوبہ چیز نکال پائے گا۔ پھر پبلشر اک کاروباری شخص ہوتا ہے۔ ایک طرف اس نے اپنی روزی روٹی کی فراخی کیلئے کوشش کرنی ہوتی ہے تو دوسری طرف اُسے اپنے ہمعصر کاروباری اداروں سے مسابقت کا مرحلہ بھی درپیش ہوتا ہے۔ پبلشروں کے ہاں تو کئی دفعہ مسکین اور نوآموز لکھاریوں کے پورے پورے مسودے گم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ناشر اُس متاثرہ ادیب کو مسودے کی دوسری کاپی لانے کی فرمائش کر دیتا ہے۔ اور اتنا ہی کہہ پاتا ہے۔

کارِ جہاں دراز ہے، اب میرا انتظار کر

ملک مقبول صاحب ایک نیک نام، ایمان دار اور انتہائی اصول پرست آدمی ہیں۔ ہر لکھاری کیلئے مقبول اکیڈمی سے اپنی کتاب چھپوانا اک سہانا سپنا ہے۔ پروپرائیٹر کی حیثیت سے ملک صاحب کو سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں ملتی ہوگی مگر حیرت سی حیرت ہے کہ عدیم الفرصتی کے باوجود انہوں نے منہ جانے کب سے لوگوں کے خطوط کو اتنی توجہ سے سینت سینت کر رکھا ہوا تھا۔ چونکہ خطوط کی ترتیب مکتوب نگاروں کے تہجی ناموں کے ساتھ منسلک کی گئی ہے، اس لئے سَن کے اعتبار سے خطوط کی قدامت کا اندازہ تو نہیں ہو سکتا لیکن خطوط کی تاریخوں پر طائرانہ نظر ڈالنے سے اتنا تعین تو ہو جاتا ہے کہ کم از کم بیس، بائیس سال سے ملک صاحب نے خطوط کا ریکارڈ رکھنا شروع کیا۔ یہ کتنا مشکل کام ہے۔ ان خطوط میں اکثر معروف ادیبوں کی زبان بڑی خشک اور کاروباری سی لگتی ہے۔ انتہائی سپاٹ او بدلحاظ لہجے میں اعتراضات، مطالبات اور فرمائشات کا طومار ہے۔ اُن کے میٹھے بول، انسانیت پرستی کے شبنمی اعلامئے، نفیٔ ذات کے دعوے اور زبان و بیان کی چاشنی کا دور دور تک نشان نہیں ملتا۔ ''اہلِ قلم کے خطوط'' پڑھنے کے بعد ایماندارانہ رائے ہے کہ مجھے پبلشر حضرات سے ہمدردی سی ہوگئی ہے۔

Marfat.com

مصلوب......ایک تجزیہ

''مصلوب'' ناصر بغدادی کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ ''بے شناخت'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ''بے شناخت'' کی کہانیوں کو بہت پذیرائی ملی اور پورے برصغیر کے دانشور طبقے نے ان کہانیوں کے محاسن کو موضوع بنایا۔ اب ان کی کتاب ''مصلوب'' زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر آ چکی ہے۔ ان کا یہ افسانوی مجموعہ صوتی اور معنوی اعتبار سے محلِ نظر ہے۔ کتاب کو دیکھنے سے جو پہلا تاثر ذہن میں آتا ہے، وہ نفاست اور فنکارانہ صناعی کا ہے۔ کتاب کی ظاہری گٹ اپ (اُٹھان) ہی اتنی پر کشش ہے کہ اس کی خوبیاں گنواتے ہوئے صفحات کالے کیے جا سکتے ہیں۔ انسان ہو یا کتاب، وہ اپنے دیکھنے اور پڑھنے والے پر پہلا تاثر اپنی ظاہری شکل وصورت سے ڈالتے ہیں۔ کتاب پڑھنے سے قبل ''مصلوب'' کے ظاہری حسن نے مجھے متاثر کیا یہ ظاہری حسن تخلیق کار کے شوق اور ذاتی نفاست کا آئینہ دار ہے۔ دو سو چالیس صفحات پر مشتمل کتاب میں شوق اور احتیاط کا پہلو یکساں اور اعلیٰ درجے کا ہے۔ ٹائٹل، کمپیوٹر کی لکھائی (کمپوزنگ) کا معیار اور پروف ریڈنگ کا ماہرانہ مظاہرہ کمال کی چیزیں ہے۔ ان تمام پہلوؤں نے کتاب کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اس کتاب میں ناصر بغداری کے پندرہ افسانے شامل ہیں۔ ہر افسانے کا رنگ ماہیت کے اعتبار سے جدا ہے۔

کہانی کا تخلیقی عمل شائد کسی افسانہ نگار کیلئے اتنا مشکل نہ ہو جتنا اس کا اظہار اور Presentation ایک مشکل معاملہ ہے۔ کیونکہ کہانیاں تو ہر روز جنم لے رہی ہیں۔ اور

Marfat.com

معاشرے کا ہر آدمی اُن کہانیوں کو کھلی آنکھ سے دیکھ رہا ہے۔ لیکن بیان کرنے کا سارا فریضہ کہانی کار پر عائد ہوتا ہے۔ چونکہ علامت میں کہانی کہنا ایک رویہ بلکہ یوں کہے کہ ایک ادبی نظریہ بن گیا ہے، اس لئے آج کا افسانہ نگار زیادہ تر علامت میں اپنی بات کہہ رہا ہے۔ یہ اک علیحدہ موضوع ہے کہ کسی علامتی افسانہ نگار کو علامت کے اظہار پر کتنا عبور حاصل ہے اور علامتی کہانی کے Concepts اس پر کتنے واضح ہیں۔ ناصر بغدادی نے ''مصلوب'' میں پوری کہانی کا احاطہ اس طرح کیا ہے کہ اُس میں کلاسیک کہانی اور جدید کہانی (علامتی) کے رنگ علیحدہ علیحدہ کر کے دکھائے ہیں اور ہر دو رنگوں کو خوب نبھایا ہے۔ سیدھی سادی کہانی کو وہی زبان دی ہے، جو اُس کا علمی و ادبی تقاضا تھا۔ اور علامتی افسانے کے ساتھ اس طرح سے انصاف کیا ہے کہ عام افسانہ نگاروں کی روش سے ہٹ کر پورے افسانے میں کوئی نامانوس بیرونِ از زبان اور گنجلک لفظ نہیں آنے دیا۔ اس طرح افسانے کی تاثیر دو آتشنہ ہوگئی ہے۔ ''چشم دید گواہ'' پہلی کہانی ہے۔ اسے آپ کلاسیکل یا بیانیہ افسانہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ کہانی لکھ کر ناصر بغداری نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کہانیاں آج بھی اپنے روائتی انداز میں جنم لے رہی ہیں۔ کردار آج بھی پوری توانائی کے ساتھ پیدا ہو رہے ہیں اور اپنا اپنا حصہ معاشرے کے بنتے بگڑتے خدوخال میں ڈال رہے ہیں۔ یہ اُس حیوانی جبلت کی رام کہانی ہے جو کسی کمزور لمحے میں مرد ذات پر حملہ آور ہوتی ہے اور پھر وہ ذاتِ شریف تمام سماجی و معاشرتی بندھنوں کی باڑ عبور کر جاتا ہے۔ تلذذ کے وہ چند لمحے پھر عمر بھر اُس کے ضمیر کا نوحہ پڑھتے رہتے ہیں۔ ''چشم دید گواہ'' کا اسرار بھی ایسے ہی کمزور لمحوں کا تخلیق کردہ ایک جنسی حیوان ہے۔ اُس کی خوبصورت بھابی اُس کے سفلی جذبات کی بھینٹ چڑھ گئی۔ نتیجتاً اس گناہ کا ایک چشم دید گواہ پیدا ہوا۔ اور یوں اسرار کے اردگرد شرمندگی، احساسِ گناہ اور ضمیر کی خلش کے جالے تن گئے۔ ناصر بغداری کا تعلق کراچی سے ہے اور اس کے سارے علامتی افسانے اس ہنگامہ خیزی،

Marfat.com

بدامنی، لاقانونیت اور قتل و غارت کا احاطہ کرتے نظر آتے ہیں، جو اس بدنصیب ''عروس البلاد'' شہر کا مقدر بنتے رہے ہیں ''خوف زدہ کتے'' اس تناظر میں لکھی گئی ایک بہترین کہانی ہے۔ اگر چہ یہ اک علامتی افسانہ ہے مگر ان علامتوں کی وضاحت بھی افسانے میں جگہ جگہ پائی جاتی ہے۔ انسانوں کی وحشیانہ چیر پھاڑ اور دِن دیہاڑے کی خونریزیوں سے خوف زدہ ہو کر گھر کے پالتو کتے نے بھی انسانوں میں رہنے سے انکار کر دیا۔

''بے دست و پا'' کا پس منظر بھی وہی معاشرتی ناآسودگی اور سماجی ابتری ہے۔ یہ بھی ایک بیانیہ کہانی ہے۔ ایک غریب بچہ کھیل کود میں معذور ہو جاتا ہے۔ یہی معذوری اس کیلئے بعدازاں ایک نعمت بن جاتی ہے کیونکہ لوگوں کا جذبۂ ترحم اُس کی روزی کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ معاشرے کے کئی ایک پہلوؤں کی اس کہانی میں نشاندہی ملتی ہے۔ ناصر بغداری بنیادی طور پر ماہر اقتصادیات ہیں۔ شائد یہ اُن کے شعبے کا کمال ہے کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں رمزیت اور حقیقت کو بڑی چابکدستی سے برتا ہے اور افسانے کے تہہ در تہہ مکاشفے کو بڑی ہنرمندی سے اُستعمال کیا ہے۔ ''حاسد'' بھی ایک سیدھی سادی کہانی ہے۔ دو رشوت خور کردار ہیں۔ جو ایک دوسرے پر دولت کے اظہار کیلئے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بالآخر اُن میں سے ایک کسی سیاسی ہنگامے میں پولیس کی گولی لگنے سے موت کے منہ میں چلا جاتا ہے اس کے نام پر اخباری ضمیمے چھپتے ہیں۔ وزیراعلیٰ کی طرف سے اُس کی موت کی بڑی پذیرائی ہوتی ہے۔ حسد کی آگ میں جلنے والا دوسرا رشوت خور بعداز مرگ بھی اپنے مخالف کی عزت افزائی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کہانی میں ناصر صاحب نے اک عجب سا متضاد ماحول باندھا ہے۔ ماحول کا بدلتا منظرنامہ ایک کی بجائے دو کہانیوں کو سمت عطا کر رہا ہے۔ اس طرح کی متضاد صورتِ حال میں سے کہانی کو بچا کر لے جانا بہت مشکل کام ہے۔ ایک طرف رشوت سے میلاد اور ختم القرآن کی محفلیں بپا ہو رہی ہیں۔ دفتری سا ماحول ہے جہاں رشوت سے لوگ

Marfat.com

چاندی بنا رہے ہیں اور دوسری طرف سیاسی ہنگاموں، مسلّح خونریزی اور لاقانونیت کا تانا بانا ہے۔ ان دو منظر ناموں کا آپس میں تال میل کہیں ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ افسانہ نگار کے اپنے ذہن میں کوئی رمزیت ایسی موجود ہو جو سطحی علم رکھنے والے قاری کی آنکھوں سے اوجھل اور ذہنی پہنچ سے ماوراء ہو۔ حیرانگی کی بات ہے کہ بدامنی اور لاقانونیت سے بھرپور یہ افسانہ 1962ء میں لکھا گیا۔ مگر یہ کتنی بڑی بدنصیبی ہے کہ بیالیس سال گذرنے کے باوجود یہ خونی منظر آج بھی وہی کا وہی ہے۔ اور محسوس ہوتا ہے کہ کہانی کار آج کی کہانی بیان کر رہا ہے۔

ناصر بغدادی ایک کامیاب کہانی کار ہیں۔ اگر چہ بعض کہانیوں کی بنت کے ساتھ وہ کماحقہٗ انصاف نہیں کر سکے۔ مگر کہانی کا مواد چننے میں وہ یقیناً مہارت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ناصر بغدادی کا ادبی سفر ابھی جاری ہے۔ اور ''بے شناخت'' سے لیکر ''مصلوب'' کے افسانوں تک مسلسل ارتقاء کا جو عمل نظر آتا ہے، وہ آنے والے وقت میں ناصر بغدادی کے ادبی مقام کا تعین بھی کرتا ہے۔

Marfat.com

''کسی حیران ساعت میں''......زندہ شاعری

جدید نظم کی وسعتیں نقاد کی گرفت سے باہر اُچھل گئی ہیں۔ یہ فقرہ یا جملہ یقیناً کئی پیشانیوں پر بل پڑنے کا سبب بنے گا۔ کسی بھی موضوع پر نقد ونظر کے لئے کچھ بنیادی پیمانے اور کچھ مبادیات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب ایک ادبی صنف کا پھیلاؤ بے تحاشا ہو جائے اور اس میں نئی آوازوں کی تعداد اتنی بڑھ جائے کہ بقول شخصے کان پڑی آواز سنائی نہ دے تو پھر تمیز کی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ گذشتہ تیس پینتیس برسوں میں نظم میں اس قدر تجربے ہوئے اور ایسی ایسی صوتی ومعنوی تشکیلات در آئیں کہ کسی نقاد کیلئے تنقیدی پیمانے پر کسی نظم کو پرکھنا ناممکن ہو گیا۔ نظم پر تنقید تو شائد جاری ہے لیکن تنقید کا مرکزۂ خیال چیستاں ہو گیا۔ اب نظم معریٰ، غیر معریٰ اور نثری نظم کی بات قصۂ پارینہ بن گئی ہے۔ ''نظم میں انتہائی صحت مند رجحانات نے جنم لیا ہے۔ جدید نظم نے مروجہ پیمانوں کو کہیں پیچھے چھوڑ کر وسیع فضاؤں میں سانس لینے کا ہنر سیکھ لیا ہے''۔ یہ ہے وہ نظریہ جس نے نظم کو بے محابہ وسعتوں کا جواز عطا کیا ہے۔ اس بات سے قطعی مفر نہیں کہ واقعی نظم کی وسعت نے اُردو کا دامن فکری اعتبار سے بھر دیا ہے۔ لیکن اس صورت حال نے زبان و بیان کے سرعت پذیر تجربات سے کچھ ایسے نقصان بھی پہنچائے ہیں جن کا ذکر بھی جدیدیت پسند برداشت نہیں کرتے۔ نقاد جدید تنقیدی زاویئے تراشنے میں اس لئے کامیاب ہوتا نظر نہیں آتا کہ نظم کی آئے دن بدلتی صورت اس کی تنقیدی نگاہ کو کہیں ٹھہرنے کا موقعہ نہیں دے رہی اور اس طرح جانچ پرکھ کا معیار متاثر ہو رہا ہے۔ ہماری بعض انتہائی صحت مند جدتوں کے ساتھ ایک بڑا المیہ رہا ہے۔ ادب کی کسی صنف کے نظام میں جونہی کوئی مثبت

Marfat.com

تبدیلی آتی ہے اور اس تبدیلی کے نتیجے میں وہ نظام پذیرائی حاصل کرنے لگتا ہے تو طا
آزماؤں کا ایک پریشر گروپ اسی جانب دوڑ پڑتا ہے۔ اور پھر جو حشر جدید فکری رویے
ہوتا ہے، وہ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ زیادہ دور نہ جایئے۔ ہم نے علامت اور تجرید کا
حال کیا۔ کہانی اس طرح مبہم اور بے معنی ہو گئی کہ چار دانشور نقاد مل کر بھی کہانی کے مرکزی
پیغام کو نہیں نکال سکتے۔ اور جب کچھ نہ بن پڑا تو اس فلسفے کا سہارا لیا گیا کہ ادیب عام
قاری کیلئے نہیں بلکہ "طبعۂ دانشوران (Intelligentsia) کیلئے لکھتا ہے۔ کیونکہ عام
قاری کا علم حرف مفقود ہے۔ گویا ہم نے کہانی سے اس فرد کو نکال باہر کر دیا جس کے لئے
یہ کہانی لکھی جا رہی ہے۔ ہم نے کشمیریوں کو درمیان سے نکال کر تنازعۂ کشمیر پر مذاکرات
کرنے ہیں۔ غزل کے پندار پر ہم نے اتنے پھاوڑے چلائے کہ اُس کا پندار زخم زخم اور
لہولہو ہو گیا۔ مگر اُس کے خوبصورت نقش و نگار کو تبدیل نہ کر سکے البتہ ہماری کوشش سے کچھ
اور طرح کے شعری نمونے تخلیق ہو گئے لیکن انہیں غزل کا متبادل نہیں کہا جا سکتا۔ نظم میں
ایک کمال ضرور ہوا کہ کچھ باشعور لوگوں نے انتہائی سنجیدگی سے نظم کو تمام تر فکری نظام کی
روایت کے ساتھ اس طرح جدید رنگ میں ڈھالا کہ اس کی پیشکش Presentation
قاری کیلئے ایک خوشگوار بلکہ دلکش تجربہ اور مطالعہ بن گئی۔

بہت دن ہوئے مرحوم وزیر آغا نے مجھے پڑھنے اور پھر کچھ لکھنے کے خیال سے
اک کتاب عطا کی تھی یہ جدید نظم کی کتاب تھی۔ 'کسی حیران ساعت میں'۔ نوجوان شاعر
ہیں فیصل ہاشمی، جنہیں میں چونکہ قطعی طور پر جانتا نہیں ہوں اور نہ ہی کبھی ملاقات رہی، پھر
مستزاد مجموعہ بھی جدید نظموں کا۔ بہت دنوں تک میں اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ لیکن
جب کتاب پڑھنے لگا تو احساس ہوا کہ یہ نوجوان گہرے شعری مطالعے کے ساتھ نظم کی
دنیا میں وارد ہوا ہے۔ اس نے اپنے قاری کیلئے اس وجہ سے بھی حیرتیں تراش کی ہیں کہ
اس کی عمر کے نئے لکھنے والے ابھی وہ حرف و صوت سیکھ رہے ہوتے ہیں جن سے انہیں

Marfat.com

''جدید نظم گر'' مانا جائے۔ 'کسی حیران ساعت میں' کا مطالعہ میرے لئے اک خوشگوار تجربہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے فیصل کو نظم کی روایات، لفظ کے صوتی و معنوی تصور و تفہیم اور جدید تر سرعت رفتار زندگی کے میکانکی رخ کا پورا شعور ہے۔ اس کی شاعری کا فکری نظام گھاڑت کی بجائے فطری ردعمل کے تاروپود سے پیدا ہوا ہے۔ اس نے فکر و خیال کے تمام مراحل میں زبان و بیان کے خوبصورت کلاسیک کو پس منظر میں چھوڑنے یا ماضی میں دھکیل دینے کی کوشش نہیں کی۔ اور مختصر نظم میں وہ پورے کا پورا ابلاغ تخلیق کیا جس کے لئے طویل نظم درکار تھی۔ لیکن وہ اس بات کا پورا شعور رکھتا ہے کہ پاپ موسیقی کے دور میں الاپ کہیں پیچھے نہ رہ جائے۔ اس نے پاپ راگ کے ساتھ تال میل جوڑے ہیں اور جدید ترین نظم نگار ہونے کے باوجود مجھ جیسے روایت پسند قاری کو بھی اپنی فنکارانہ چابکدستی اور زبان و بیان پر مکمل عبور کی وجہ سے سرشار کیا ہے اور ان تمام شعری ضرورتوں کا پورا خیال رکھا ہے جو اعتدال کی بنیاد بنتی ہیں۔

نوسٹیلجیا (Noslatgia) اگرچہ ماضی قریب سے ہمارے ادب میں متفرق جھلکیاں دکھاتا رہا ہے اور میر تقی میر سے لے کر افتخار عارف تک کہیں کھلے اور کہیں دبے دبے اس کی بازگشت ہمیں سنائی دیتی رہی ہے اس طرح نوسٹیلجیا نہ صرف ہر دلعزیز اصطلاح بنی بلکہ اُس کے (Parameter) پیرامیٹر اور ڈائمنشن (Dimenision) پر بھی لوگوں کی نظر پڑی۔ انتظار کے ہاں نفسیاتی نشاندہی ملتی ہے۔ ناصر کاظمی نے زیادہ کھل کر کہا کہ انبالہ ایک شہر تھا۔ سنتے ہیں اب بھی ہے۔ فیصل ہاشمی بھی اپنے مرکز و محور سے دور ہے اور Home Sickness کا شکار بھی۔ مگر اس کا نوسٹیلجیا دھند میں چھپا ہوا ہے۔ اس کی اُداس آواز میں ہائے وائے کا تاثر نہیں ملتا۔ بلکہ فیض سا اک لطیف لمس ملتا ہے۔ پردیس کو فیصل ہاشمی نے اک ضرورت سمجھ کر قبول کیا ہے اور یاد کو کسک کے محدود پنجرے میں بند کر رکھا ہے۔ نظم ''اندیشہ'' میں وہ کہتا ہے۔

Marfat.com

میں یہی سوچ کے
کل رات نہیں سویا، اگر
نیند پھر آئی تو درخواب کا کھل جائے گا
اور کتنے ہی عذابوں کا ستم بار ہجوم
صف بہ صف بڑھتا ہوا میری طرف آئے گا

فیصل کی نظم ''پہچان'' شدید احساس کا اک دوسرا منظر نامہ پیش کرتی ہے۔ آپ بھی لطف اٹھائیں۔

کسی بھی موڑ پہ رک کر جو پیچھے دیکھا ہے
تو ایک یاد ملی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی
تو ایک رات ملی سوگوار، سہمی ہوئی
تو ایک خواب ملا، دربدر بھٹکتا ہوا
اور ایک جسم ملا جس کے سر کے بالوں میں
گزرتے وقت نے لمحوں کی راکھ ڈالی ہے
وہ جسم میرا نہیں ہے تو پھر وہ کس کا ہے

اُس کی نظم ''کئی لمحے......'' میں بے ساختگی اور اظہار کا فطری بہاؤ کمال کا ہے۔ بڑی سادہ اور معصوم یادیں ہیں۔ ان یادوں میں کھو کر وہ دردیا سینے میں اٹھنے والے طوفان کا شاکی نہیں ہوتا بلکہ یہ یادیں اسے لطف دے جاتی ہیں۔ وہ گذرے لمحوں کا تقابل اپنے حال سے نہیں کرتا۔ حال اور ماضی اس کے نزدیک دو الگ الگ منظر ہیں اور وہ ایک وقت میں صرف ایک منظر سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ نظم کیا ہے اک پوری کہانی ہے۔ آغاز ایک پر لطف یاد سے ہوتا ہے اور اس کا اختتام وقت سے مکالمے کی صورت میں ہوتا ہے۔ یہ مکالمہ بھی اڑتے ہوئے لمحوں کی کہانی کا فلسفہ ہے۔ شاعر وقت سے گذرے

Marfat.com

ہوئے لمحے واپس مانگتا ہے مگر یہ لمحے کلائی پر بندھی گھڑی کے محتاج نہیں
تمہیں معلوم ہے جب بھی
پرانے یار
گلیوں کی
یونہی بے سود باتوں میں
کئی گھنٹوں کی بے مصرف
نشستِ رایگاں کو
یاد کرتے ہیں
تو کتنا لطف آتا ہے
پرانے گھر میں گذرے پل
اور ان میں سب کہی اور ان کہی
باتوں کو جب دہرایا جاتا ہے
تو کتنا لطف آتا ہے
''وقت اُس سے اس طرح ہمکلام ہوتا ہے
کئی لمحے......
کلائیوں پر بندھی گھڑیوں سے باہر ہیں
انہیں میں کیسے واپس دوں
انہیں میں کیسے لوٹا دوں۔

فیض کی دکشن یا شعری اسلوب کو شائد ہی آج تک کسی نے برتنے کی کوشش کی ہو کیونکہ اس میں دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں۔فیصل نے لاشعوری طور پر ایک ایسا شعری رویہ اپنایا ہے جس کے تانے بانے فیض کے طرزِ احساس سے بڑی مشابہت رکھتے

Marfat.com

ہیں۔اس کی نظم ''تخلیق'' پر اک نظر ڈالئے اور پھر کہئے کہ میرا مشاہدہ ٹھیک ہے یا غلط

رات کی راہ سے ہٹ کر، کسی غم خانے سے
چاند چپکے سے نکل آیا تھا
کتنی کلیاں تھیں جو ذہنوں میں مہکتی دیکھیں
برف کے ایک پگھلتے ہوئے سناٹے میں
کتنی صدیاں تھیں جو خاموش گذرتے دیکھیں
اپنی ہی آگ میں جلتے ہوئے پیڑوں پہ اگر
اس گھڑی بور جو اترا تو جنم ہو گا ضرور
ایسی نظموں کا جو مہکار میں ڈوبی ہوں گی

اُس کی نظم ''آخری ملاقات'' میرے نزدیک امیجری کی وہ کیفیت ہے جسے محسوس کیا جا سکتا ہے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ محض پانچ مصرعوں میں پوری کی پوری کہانی کہہ ڈالنا خونِ جگر کا متقاضی ہے۔ شام، دھوپ، جنگل اور سورج جیسا متضاد منظر فیصل نے اک نظم بلکہ مختصر نظم میں اس طرح اکٹھے کئے ہیں کہ وہ اک دُوجے میں پیوست ہو کر ابلاغ کا شہکار بن گئے ہیں۔ قاری کی (Visualization) کو فیصل نے انتہائی جابکدستی سے متحرک کیا ہے۔

دور تک پھیلے ہوئے ایک گھنے جنگل میں
دو شجر کھینچ کے سایوں کو جہاں ملتے ہیں
اس جگہ دھوپ بھی سورج سے ملا کرتی ہے
اوڑھ کر شام کی پھولوں بھری چادر اکثر
جیسے دو شخص بچھڑنے کے لئے ملتے ہیں

فیصل کے اسلوب میں بڑے واضح اشاریئے ملتے ہیں۔ رات، نیند، شام، جسم

Marfat.com

درخت اور پتے راہ اور رستے وہ استعارے ہیں جن کو فیصل نے بار بار استعمال کیا ہے اور اس خوبی کے ساتھ کیا ہے کہ ہر خیال میں یہ استعارے اپنے نئے اور بھرپور معنی کے ساتھ وارد ہوتے ہیں اور قاری کے قلب و نظر کو سیراب کر جاتے ہیں۔

فیصل ہاشمی کے پاس وافر اور صحت مند شاعرانہ اہلیت موجود ہے۔ اس کے سامنے نظم کا اک وسیع میدان موجود ہے۔ اسے اپنے ادبی اسپ تازہ دم کو صحیح سمت میں باگ دے کر دوڑانا ہے اُسے اپنی اگلی منزلوں پر اس طرح نظر رکھنا ہوگی کہ کہیں تعریف و توصیف کے مبالغہ آمیز جھکڑ اُس کا قلمی پینڈہ کھوٹا نہ کر دیں۔

Marfat.com

آغا گلؔ کے افسانوں کے خدوخال

بھلا ہوانگریز حکمرانوں کا کہ اُنہوں نے ''سوزِ وطن'' کوضبط کرلیا۔اگر فرنگی یہ ظالمانہ قدم نہ اُٹھاتا تو شائد اُردو ادب میں افسانہ نگار خال خال ہی ملتے۔منت سماجت اور معافی تلافی سے پریم چند کی نوکری تو بچ رہی لیکن اُس کے اندر کے افسانہ نگار نے اُسے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔چنانچہ تخلیق کا جو عمل اُس کو اندر سے کھانے لگ گیا تھا اُسے علامت کے گھوڑے پر بٹھانا اُس کی مجبوری بن گیا۔پریم چند سے لے کر آزادی کے حصول تک افسانہ نگار یا کہانی کار کو علامت نگاری کا ایک جواز کسی نہ کسی طور میسر رہتا ہے کیونکہ استبدادی طاقت نے بے محابہ دار ورسن کے جال پھیلائے ہوئے تھے اور تعزیریں بھیانک منہ پھاڑے دانشور کو ہڑپ کرنے کے لئے تیار رہتی تھیں۔اُس دور کے علامتی افسانوں میں علامت پکار پکار کے اپنا مفہوم ادا کرتی ہے۔افسانے کا کہانی پن بہت واضع شکل میں قاری کے سامنے آتا ہے۔اور مرکزہ خیال کسی لمحے ذہن سے اوجھل نہیں ہوتا۔انجمن ترقی پسند مصنفین اور پھر حلقہ ارباب ذوق نے اُس فضا (Phenomenon) سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔اور ہر لکھنے والا صرف جدت پسند بلکہ ترقی پسند کہلانے کے احساس کمتری میں مبتلا علامت کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ گیا اور اس طرح علامت جس نے مجبوری سے سفر کا آغاز کیا،ایک مشن بن کر سڑکوں پر آگئی اور منٹو جیسے بین الاقوامی سطح کے کہانی کار کو جدت پسند اس لئے اپنے حلقوں میں سمونے پر تیار نہ ہوئے کہ اولاً وہ علامت کا سہارا لینے کو تیار نہیں تھا اور ثانیاً اُسے کہانی کہنے کا فن آتا

Marfat.com

تھا۔لہٰذا اس کی شخصیت کو مدھم کرنے کی بہت کوشش کی گئی۔ قیامِ پاکستان کے بعد تھوڑا سا وقفہ ایسا آیا جب خاک و خون میں لتھڑی داستانیں اتنی زیادہ تعداد میں منظر عام پر آئیں کہ ادبی نظریات، اسلوب گری اور زمانہ امن کے دیگر سارے ادبی مباحث پس منظر میں چلے گئے، پھر جانے کیا ہوا کہ شاعر اور افسانہ نگار ادیب سے سیاسی کارکن بن گیا۔ شائد انقلاب روس کے نظریہ سازوں کی پیروی کی بھیڑ چال کا اثر تھا یا ذاتی مفادات کا کوئی المیہ کہ ادیب جس کا بنیادی موضوع انسان اور انسانیت ہے، وہ دائیں بازو اور بائیں بازو کے کیمپوں میں ایسا تقسیم ہوا کہ آج یہ دونوں کیمپ ایک دوسرے کو جھوٹا اور بے بنیاد ثابت کرنے کے لئے قلم کا سارا زور اور ذہن کی کُل توانائیاں صرف کر رہے ہیں۔ رجعت پسند اور لادین کے دو واضح لیبل ہیں جو ادیب اک دوسرے کے ماتھے پر چسپاں کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

پس منظر بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آج افسانہ نگار کے ہاتھ سے کہانی کا فن نکل گیا۔ الٹی سیدھی علامتوں اور تجرید کا سہارا لے کر اور پانچ سات صفحے میں کہانی کہہ کر وہ فرض سے سبکدوش ہو رہا ہے۔ اس علامت اور تجرید کے وہ گونا گوں جواز اور عذر بھی تلاش کر لیتا ہے، اصل بات یہ ہے کہ جدید افسانہ نگار آرام طلب ہو گیا اور اُس کے پاس اتنا وقت بھی نہیں کہ وہ حس و قبح کے تمام پہلوؤں کا کھلی آنکھ سے مشاہدہ کرتے ہوئے اپنی کہانی مکمل کرے۔ آج کے افسانے کو پڑھ کے یوں لگتا ہے کہ کہانی ختم ہو گئی ہے۔ لیکن میرا یہ ایمان ہے کہ کہانیاں نت نئے مسائل کو جلو میں لے کر جنم لے رہی ہیں۔ میرا یہ نظریہ اور بھی پختہ ہو جاتا ہے جب آغا گل کے افسانوں کی بنت اور گھاڑت پر اک نظر ڈالتا ہوں۔ میں آغا گل کو دوسرے افسانہ نگاروں کی صف میں گنتی کرتا ہوا چلا جاتا لیکن اُس کے کہانی کہنے کے انداز اور زندگی کے مختلف فلسفوں سے بحث کرتے ہوئے اپنے قاری کو ساتھ ساتھ لے کر چلنے کے سٹائل نے مجھے قدم قدم پر چونکا دیا۔ مجھے یہ شرف

Marfat.com

حاصل ہے کہ میں آغا گل کے ادبی ارتقاء کا عینی شاہد ہوں۔ اُن کی تمام تخلیقات از قسم ناول، تحقیق و تدوین اور مجموعہ ہائے افسانہ مجھ تک پہنچتی رہی ہے ناول کے پھیلاؤ اور اسکوپ کی وسعت کی وجہ سے آغا گل اپنے ناولوں کے تاروپود ہیں اگر چہ گھٹا گھٹا (Uncomfortable) دکھائی دیتا ہے۔ لیکن افسانے کی تخلیق میں وہ اپنی موزوں طبع کی جولانیاں دکھاتا ہے۔ ویسے اپنی ادبی ذات کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ خود کہتا ہے۔

''افسانہ نگاری ایک اذیت ناک عمل ہے۔ میرے افسانوں کے کردار مجھے گھیر لیتے ہیں۔ لپٹ لپٹ کے روتے ہیں چیختے ہیں، چلاتے ہیں۔ دِل کاٹ کے رکھ دیتے ہیں۔ اُن کے ہمراہ زیادہ عرصہ رہنا بہت ہی مشکل کام ہے اس لئے میں ناول نہیں لکھ سکتا......''

یوں تو اردو ادب میں شاعری اور نثر میں لوگوں نے علاقائی زبان کے تجربے شروع کئے ہیں۔ لیکن زیادہ تر یہ کوششیں ناکام رہیں۔ یا تو لوگوں نے اس تجربے کو بھاری پتھر سمجھ کے چوم کے چھوڑ دیا اور اپنی روش بدل ڈالی اور یا پھر تجربہ کرتے کرتے گمنامی کی نذر ہو گئے۔ شائد اس حقیقت کا آغا گل کو ادراک ہے۔ اُس نے براہوی اور بلوچی زبان کو بھرپور طور پر اپنے افسانوں میں متعارف کرایا ہے۔ لیکن زبان و بیان پر کامل عبور کا یہ عالم ہے کہ اُس نے جہاں جہاں بھی براہوی یا بلوچی زبان کے تڑکے لگائے ہیں، وہاں وہاں اُردو زیادہ بلیغ ہو کر سامنے آئی ہے۔ اُس نے اپنے اکثر افسانوں کے نام براہوی اور بلوچی زبان سے لئے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آج کا محقق یا نقاد آغا کے گیت گانے لگے گا کیونکہ یہ ہمارا قومی مزاج نہیں کہ کوئی زندہ شخص ایک تاریخی کام کر رہا ہو تو اُس کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ لیکن تاریخ آغا گل کا نام احترام سے لے گی کہ علاقائی تہذیبوں کی اجنبی عصبیت اور منافرت کے اندھیروں میں کس طرح ایک شخص علم و آگہی کا پرچم اٹھائے ان متضاد بلکہ متصادم تہذیبوں کو آپس میں متعارف کرانے کی فکری و ادبی کوششیں

Marfat.com

کرتا رہا۔ بلوچستان کی زبانوں کو آغا گل نے سرسری نہیں پڑھا بلکہ اُن کی روح اور روٹس (Roots) تک سے مکمل آشنائی حاصل کی۔ وہ اُردو اور انگریزی ادب کا فارغ التحصیل عالم ہے۔ لہٰذا اس ساری آگہی نے اُس میں زبانوں کے اختلاط و امتزاج کا ایک اعلیٰ سلیقہ پیدا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ براہوی اور بلوچی زبان کی اصطلاحیں اُس کے افسانوں میں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ اُس نے اپنے افسانوں کے نام گنوک (دیوانہ) پرغٹ (مینڈک) پو بندرغ (رینگنے والا انسان) اور سرگک (کچھوا) جیسے رکھے ہیں۔ مختلف علاقائی اصطلاحات اور براہوی رسم و رواج سے مختلف معلومات اُس کے افسانوں میں فراوانی سے ملتی ہیں۔ ایزک (دہی کی مشک) زک (گھی کی مشک) دبہ (تیل کی مشک) امیان (آٹے کا بڑا مشکیزہ) گونچان (آٹے کا چھوٹا مشکیزہ) کھلی (پانی کا سفری مشکیزہ) نود بندرغ (بادلوں کو قابو کرنے والا) ہڈ پیر غنگ (وہ رسم جس سے ایک غیر براہوی شخص براہوی قبیلے کا فرد بنتا ہے) نکڑے (چھوٹے بچے کے لئے پیار کا لفظ) گواڑخ (لالۂ صحرائی) جیسے بیسیوں لفظ وہ انتہائی خوبصورتی کے ساتھ اُردو کے کینوس پر موتیوں کی طرح جڑتا چلا گیا ہے۔ پورا بلوچستان آغا گل کے افسانوں میں اپنے مکمل پس منظر کے ساتھ گنگناتا ہوا ملتا ہے۔ مجھے اپنی عسکری ملازمت کے دوران کوئٹہ اور اندرون بلوچستان میں کچھ وقت گزارنے کا موقعہ ملا ہے۔ جب آغا گل اپنے کسی افسانے کی نیو بلوچستان کے کسی شہر یا قصبے کی منظر کشی (Description) پر اُٹھاتا ہے تو میں اپنے ماحول سے تھوڑی دیر کے لئے کٹ کے بلوچستان پہنچ جاتا ہوں۔ سبی، ناڑی، بابر کچھ، ہرنائی، لہڑی، تھہڑی، پٹ فیڈر، سارا وان، جھالاوان سے لیکر قلعہ سیف اللہ، گلستان، مسلم باغ، شیلا باغ اور چمن تک کا پورا بلوچستان تسبیح کے دانوں کی طرح قرطاسِ ذہن پر بکھر جاتا ہے۔ ''ٹرن ٹیبل'' آغا گل کا ایک ایسا (Solo Character) افسانہ ہے۔ جسے بلاخوف تردید عالمی ادب کے کسی بھی پلیٹ فارم پر بطور ماڈل رکھا جا سکتا ہے، اگرچہ

Marfat.com

افسانے کی ساری بنت آرتھر جاوید کے کردار کا احاطہ کرتی ہے۔ لیکن جس طرح کوئٹہ کے ریلوے کے طریقہ کار، ریلوے کالونی اور شہر میں ہوٹلوں کی نوعیت اور وہاں استعمال ہونے والی معروف اصطلاحات کو آغا نے (Describe) کیا ہے، پورا شہر اور اُس کا تہذیبی پس منظر کاغذ پر سجا کر رکھ دیا ہے۔ افسانے کی (Treatment) ایک علیحدہ سا موضوع ہے۔ لیکن یہ دیکھیئے کہ آغا گل کو اپنے قاری کو مسمیرائز کر کے اپنی انگلی پکڑا کر ساتھ لے چلنے کے فن پر کتنا ملکہ حاصل ہے۔ خوبصورتی کی بات یہ ہے کہ افسانہ تو افسانہ ہے لیکن جس طرح آغا گل نے فرضی کرداروں کو حقیقی نام دیئے ہیں اُس نے افسانہ کے ''کہانی پن'' کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ فرح ہوٹل، نشاط ہوٹل، بلوچستان رائٹرز گلڈ، پروفیسر کرار حسین، سید خلیل، پروفیسر نبوت یار خان اور چشتی جیسے نام اور مقام کسی ادب شناس بندے کے لئے نئے نہیں جسے کوئٹہ میں رہنے کا اتفاق ہوا ہو۔

تقسیم برصغیر اپنے ساتھ ہزاروں خونچکاں کہانیاں لے آئی۔ گھر لٹے، وطن چھوٹے عصمتیں تاراج ہوئیں۔ ہزاروں انسان خون میں بے قصور نہا گئے۔ اُس دور کے افسانہ نگاروں نے انسانی مصائب پر بے پناہ لکھا۔ ہر طرف ظلم کے اوراق بکھرے ہوئے تھے۔ اور ہمارا دانشور اُن اوراق کو چنتے چنتے تھک گیا۔ پھر ایک وقت آیا کہ زخم بھرنے لگے اور دل کو قرار سا آ گیا۔ قتل و غارت کو خدا کی آئی سمجھ کر لکھنے والے کی توجہ بھی دوسرے مسائل اور موضوعات کی طرف مائل ہو گئی۔ آج کا جدید افسانہ نگار کوئی بھی تقسیم کے حوالے سے نہیں لکھ رہا۔ مگر آغا گل کے آنسو آج بھی خشک نہیں ہوئے۔ اُس کی روح کو اس تقسیم سے جو زخم لگے، وہ آج بھی ہرے بھرے ہیں۔ اُن سے خون آج بھی رِس رہا ہے۔ تقسیم کے حوالے سے جتنے بھی کردار آغا گل نے تخلیق کیے، وہ خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر تخلیق ہوئے ہیں۔ جب وہ لٹ پٹ کر بلوچستان پہنچنے والے مسلمانوں کی (Characterization) کرتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ اپنا درد بھرا دِل اُس نے کاغذ پر

Marfat.com

کال کر رکھ دیا ہو۔ اُس کے افسانے ''روپے کا جن'' کو پڑھنے کے لئے بڑا دِل گردہ چاہئے۔ اگر چہ سنڈریلا اور جلال خان (جن بابا) کی صورت میں ہمیں رومان اور محبت کی ایک روائتی کہانی ملتی ہے۔ لیکن افسانے کا سارا کمال اُس منظر کاری میں ہے۔ اور اُن نفسیاتی اور مادی محرومیوں کی تصویر کشی میں ہے جس سے سرحد پار سے لُٹ کر آنے والے ایک تعلیم یافتہ گھرانے کو واسطہ پڑتا ہے۔

''قبائلی ذہن تو تربور (کزن) کو بھی قبول نہیں کرتا۔ کجا لٹے پٹے لوگوں کے جم غفیر جو ان کی دھرتی میں در آئے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر سمت پھیلتے چلے جا رہے تھے۔ ہمیں وہ نفرت اور خوف کی نگاہ سے دیکھتے اور پناہ گزیں کی بجائے ''پناہ گوز'' کہتے ہیں۔ ہمیں دیکھ کر اُن کا ذوقِ ایرانی بھی زیادہ بھڑک اٹھتا اور کچھ نہیں تو ہاتھ ہی پھیر کر گزر جاتے......''

''میرا دِل چاہنے لگا کہ اسکول کی چھت پر چڑھ کر چیخ چیخ کر بلاؤں انگریزوں کو کہ آؤ ہمیں دوبارہ غلام بنالو۔ مگر ہمارے عزیز رشتہ دار، ہمارے گھر ہماری زمینیں ہمیں واگزار کرادو نجات دِلادو ہمیں آزادی کی اس ذلت سے......''

اُس کا افسانہ ''ڈاک خانہ ککڑ'' بھی ایک ایسی دُکھ بھری کہانی ہے کہ امرتسر کا قمرالدین ڈار کس طرح دھکے کھاتا ہوا لورالائی کے گاؤں نجما دمیں آ کر قمرو رہ گیا۔ ''ہم آسمان سے گرے پاتال میں چلے گئے اس ملک کے لئے۔ مگر اس ملک کا شہری نہیں ہوں۔ میں اب کہاں کا شہری ہوں؟ کس ملک کا؟ کوئی شخص پوری دنیا میں کہیں کا تو لوکل ہوگا۔ پوری کائنات میں میں نان لوکل ہوں۔ کیا یہ لوگ گھر بار چھوڑ کر امرتسر میں چپڑاسی بننا پسند کریں گے؟ کیا یہی پوسٹ لینے کے لئے میں نے سوانگ رچایا تھا''۔

''......ساگر کا جی کڑھتا مگر تحریک آزادی کا ہیرو قدرت اللہ عرف سوامی کلجگ آنند کبیر پینتھی بھی جسے قائداعظم نے میرٹھ کے جلوس کی قیادت کا اعزاز بخشا بھنگی

Marfat.com

پاڑے (کراچی) کی ایک کٹیا میں کسمپرسی کی موت مرا۔ اُس کی لاوارث لاش کو ایدھی کے
سوا کوئی دفن بھی نہ کرتا......'' آغا گل آج بھی رو رہا ہے۔ ایک جدید افسانہ نگار، ایک ہنس
مکھ جدید یورپی ادب اور مذاہب عالم سے مکمل آشنا دانشور ستاون سال گذرنے کے بعد
بھی بہت دکھی ہے۔ وہ جب کہانی شروع کرتا ہے تو کہیں نہ کہیں اس ہجرت لا حاصل
تذکرہ نکل آتا ہے اور پھر اُس کا دل خون تھوکنے لگتا ہے۔ وہ اپنے مرتبے اور اپنے فن
باریکیوں کے سارے تقاضے ایک طرف رکھ کر ننگی حقیقتوں کو موثر انداز میں بیان کرنے لگ
جاتا ہے۔ آج کے ہزاروں افسانہ نگاروں کے جم غفیر میں آغا گل کی آواز بڑی ممتاز ا
منفرد ہے۔ گنوک، پوغٹ، ایڈ کولیم، ڈاک خانہ ککڑ اور روپے کا جن وہ چند نمائندہ افسا
ہیں۔ جن میں حساس آغا گل بین کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

افسانے کی کچھ اپنی روائت ہیں یا کیا ہے کہ میں نے آج تک جتنے بھی افسا
نگار پڑھے ہیں، وہ اچھے کہانی کار، زبان کے دروبست سے کما حقہ واقف اور افسا
ماحول باندھنے کے ماہر تو نظر آئے، لیکن اُن کے افسانوں میں تاریخ، یورپی ادب
قدیم مذاہب کے حوالے میں نے کبھی نہیں دیکھے، شائد وہ اُسے اپنا منصب ہی نہ سمج
ہوں آغا گل کے ہر افسانے میں قدیم واقعے، کسی مذہبی رسم یا کسی قدیم فلسفہ زندگی
بارے میں نشاندھیاں ملتی ہیں۔ یہ ہرگز نہیں کہ وہ اپنی وسعت علم کی دھاک بٹھانا چ
ہے اور یہ بھی نہیں کہ اس نے کہیں پورے پورے فلسفوں کی تفسیریں لکھی ہیں اور نہ
اپنے کرداروں سے لمبے لمبے ڈائیلاگ اگلوائے ہیں۔ بلکہ کہیں ایک آدھ جملہ اور کہ
ایک آدھ سطر افسانے میں ایسی آ گئی ہے جو پورا پیغام دے گئی۔ اور افسانے کا مزا دو
ہو گیا ہے کمال کی بات یہ ہے کہ آغا گل کے تجزیئے بڑے چونکا دینے والے ہو
ہیں۔ خاص طور پر اُن علامتی افسانوں میں یہ صورت بڑی فراواں ہوتی ہے جہاں آ
کہانی کو ملبوس کرنا پڑتا ہے۔

Marfat.com

''حضرت عیسیٰ علیہ السلام مُردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے مگر انہوں نے کسی بیوقوف کو عقل مند نہ بنایا نابینا کو آنکھ مل گئی مگر کسی کو فہم وشعود نہ ملا۔ خرعیسیٰ بھی گدھے کا گدھا ہی رہا۔ اسمبلی ممبر نہ بن سکا''۔

میں پہلے کہیں علامت نگاری کا ذکر کر چکا ہوں۔ علامت کے حوالے سے جب آغا گل کے افسانوں کا مطالعہ کیا جائے تو ایک اور پر لطف کیفیت سامنے آتی ہے۔ سوائے چند افسانوں کے اُس کے تمام افسانوں میں دو کہانیاں متوازی چل رہی ہوتی ہیں۔ ان افسانوں میں ایک تو وہ کلاسیکل کہانی ہے جسے سادہ لفظوں میں رومان نویسی کہہ لیں اور ایک کہانی وہ ہے جو علامتوں کے ساتھ وہ تخلیق کر رہا ہوتا ہے۔ اُس کے علامتی افسانے کی گہرائی صرف اُس وقت ناپی جا سکتی ہے جب آپ خالصتاً اس نیت کے ساتھ پڑھیں کہ وہ صرف اور صرف علامتیں لکھنے والا ہے۔ ''سُر کک'' اُس کا عام سا سیدھا سادہ پلاٹ ہے کہ دیہات سے شہر کی طرف ایک دکاندار مراجعت کرتا ہے اور پھر نا کام ہو کر اپنا اسباب اُٹھا کے واپس چلا جاتا ہے۔ یہ سر کک علی دوست ہے، سر کک کچھوے کو کہتے ہیں۔ اگر صرف اس سر کک سے علامت کی بنیاد اُٹھائی جائے تو ایک مشاہداتی سماجی واقعہ کا کینوس پھیلتا چلا جاتا ہے اور پھر پورے سماج کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اُس کے افسانوں پر تھوری غوری، آکاش ساگر، پوغٹ، ایڈ کولیم سر کک، کیسی، وادی قاف اور دوسری بابری مسجد میں علامت پکار پکار کر اپنے مفاہیم ادا کر رہی ہے لیکن صرف علامتی کہانی نے ہی جنم نہیں لیا۔ بلکہ ایک بیانیہ افسانہ بھی ساتھ ساتھ چل رہا ہے، کسی اچھا لکھنے والے اچھے افسانہ نگار کا یہ وصف بہت کم لوگوں میں ملتا ہے۔ آغا گل نے دونوں رنگوں میں کہانی کو کہیں چیستاں نہیں ہونے دیا۔

اپنے محکمے سے متعلق آغا گل نے کافی افسانے تخلیق کیے ہیں۔ جن میں

Marfat.com

ڈاکخانہ ککڑ، خان مستانہ، اُستاد مہر اور حیر جیسے افسانے قابلِ ذکر ہیں۔ محکمے سے متعلق اگر معلومات ان افسانوں میں ملتی ہیں۔ تو بات قابل فہم ہے کہ یہ محکمہ آغا گل کا اپنا ہے۔ لیکن حیرانگی اس وقت ہوتی ہے جب محکمہ ریلوے کی اصطلاحات وہ بڑی بے تکلفی سے برمحل استعمال کرتا ہوا اور اپنے قاری کو حیران و پریشان چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے، اُس کا افسانہ ٹرن ٹیبل، ملی اور اُستا مہر اُس کے علم اور معلومات کی بہترین مثالیں ہیں۔

Marfat.com

تماش بینوں میں گھری ہوئی تعلیمی پالیسی

جہاں صوبہ پنجاب کی سرحدیں صوبہ سندھ سے ملتی ہیں، وہاں اک چھوٹا سا شہر آباد ہے صادق آباد ضلع رحیم یار خان کی تحصیل ہے۔ آج تو اپنا جغرافیائی اور زراعتی اہمیت کی وجہ سے یہ شہر صنعت وتجارت کا بہت بڑا مرکز ہے لیکن اک دور تھا جب یہ اک قصبہ سا شہر تھا۔ کھلے کھلے دو چار بازار اور اک عدد وسیع غلہ منڈی۔ اس وقت اس شہر کو صرف منڈی کہتے تھے اور رحیم یار خان کو نوشہرہ کہتے تھے، کیونکہ اس شہر میں نو بازار تھے۔ صادق آباد میں تحصیل کچہری کے آگے سے ایک روڈ گذرتی ہے۔ یہ اک سرکلری روڈ ہے جو پورے شہر کو اپنے حصار میں لئے ہوئے ہیں۔ اسی روڈ پر شہر کے بڑے افسروں کے بنگلے، شہر کا اکلوتا بنک اور شہر کی سب سے قدیم جامعہ مسجد واقع تھی یہ مسجد الحمدللہ آج بھی قائم ہے۔ نیشنل بنک پہلی دفعہ 1956ء میں قائم ہوا تو لوگ دور دور سے اس نئی ''ایجاذ'' کو دیکھنے چلے آتے تھے۔ نیشنل بنک کی عمارت سے متصل اک بلڈنگ ہے جو شائد اب کسی کا گھر ہے چھ سات کمروں کی اس عمارت میں مدرسہ رفیق العلماء ہوا کرتا تھا۔ اپنی اس زوال پذیر عمر میں جب موت کے بڑھتے سائے گہرے اور گھنے ہو چلے ہیں، میں جب کبھی اس عمارت کے قریب سے گذرتا ہوں تو مجھے اس کی تاریخی عظمت سے ہمیشہ ماں کے دودھ کی خوشبو آتی ہے اور میرے لب تصور ہی تصور میں اس کی ایک ایک اینٹ کو ہزاروں بوسے دے آتے ہیں۔ یہیں پر ماسٹر مولوی شاکر، ماسٹر شاہ محمد، ماسٹر دین محمد، ماسٹر عبدالقادر، ماسٹر اللہ دتہ، ماسٹر عبدالسلام، مولوی خلیل، مولوی شریف اور ماسٹر غلام مصطفٰے جیسے عظیم اور مشینری لوگ پڑھاتے تھے۔ میں سلام کرتا ہوں عظمت وتوقیر کے

Marfat.com

مناروں کو کہ ان کے جسم پر بوسیدہ لباس، پاؤں میں خستہ حال جوتے ہوتے تھے لیکن شہر کے جس بازار اور گلی کوچے سے یہ لوگ گذرتے، بلا تخصیص لوگ کھڑے ہو کر انہیں سلام کرتے۔ بھیڑ بھاڑ ہوتی تو احتراماً ان کے لئے راستہ بنا دیا جاتا۔ کسی صلہ وستائش سے بے نیاز ان عظیم اساتذہ کو صرف ایک ہی دھن ہوتی تھی کہ ان کے سب طلباء پاس ہو جائیں۔ پانچویں اور آٹھویں درجے کا امتحان بورڈ کا امتحان ہوتا تھا۔ بورڈ کا امتحان دینے والے بچوں کے بستر سکول میں لگ جاتے تھے۔ اور اساتذہ بھی دنیا کا ہر دھندہ چھوڑ کر سکول کے ہو رہتے۔ یہ محسن استاد بچوں سے زیادہ امتحان کے بارے میں فکر مند ہوتے تھے۔ اگر کسی امتحان میں کوئی طالب علم بورڈ میں کوئی پوزیشن لیتا تو یہ مہربان چہرے مہینوں مسرور رہتے اور انہیں فخر ہوتا کہ ان کے مدرسے کے بچے نے درسِ نظامی بورڈ میں پوزیشن لی ہے اسی مدرسے میں حاکم شہر یعنی ایس ڈی ایم (آجکل اے سی) اور تحصیلدار کے بچے بھی ملیشیا پہن کر ٹاٹوں پر بیٹھ کر علم حاصل کرتے تھے۔ لیکن باپ کے عہدے کی وجہ سے کبھی ان بچوں کے ساتھ رعائتی سلوک نہیں ہوتا تھا ان بیوروکریٹ لوگوں کے بچوں کو داخل کرتے وقت ان کے والدین سے کڑی شرائط پر دستخط لئے جاتے تھے۔ سوائے سالانہ انسپکشن کے سکول میں کوئی بھی بڑے سے بڑا افسر آجائے، اس کے استقبال کا کوئی اہتمام نہیں ہوتا تھا تاکہ بچوں کا تعلیمی حرج نہ ہو۔ پانچویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے کریمہ، پندنامہ، صرف بہائی، میزان الصرف، پنج گنج اور مشکوۃ شریف بچہ پڑھ لیتا تھا۔ پانچوین سے انگریزی تعلیم شروع ہوتی تھی۔ خوشخطی اور ہر لفظ یا حرف کی صحیح اونچائی اور چھوٹائی کے لئے کھلے میدان میں ریت بچھوا کر اس پر چار لائنی کاپی کی طرح لائنیں لگا کر انگلیوں سے حروف ابجد اور تہجی کی دو ہفتے تک مشق کروائی جاتی پھر جی (G) کی نب سے کاپی پر لکھائی کا آغاز ہوتا۔ اُردو پہلے کت والے کلک کے قلم سے لکھائی جاتی اور انگلش جی کی نب سے بورڈ کے امتحان طلباء Z اور G کی نب والے قلم سے دیتے تھے۔

Marfat.com

تمام طلباء کا خط اس طرح ہوتا تھا گویا کسی نے کاغذ پر پرنٹ کر دیا ہو...... ماضی پہ بہت سی دھول پڑ چکی ہے۔ مناظر دھندلائے ہوئے ہیں۔ کچھ حافظہ ساتھ چھوڑ گیا ہے۔ بڑے بڑے جید علماء، بڑے بڑے اعلیٰ افسر اور کاروباری دنیا میں نامور لوگ میری اس مادر علمی نے پیدا کیے۔ میں گنوانے لگوں تو شائد نہ کر پاؤں میاں سعید آج پام آئل انڈسٹری میں دنیا بھر میں مانا پہچانا نام ہے، اس کا کاروبار آج ملائشیا، سنگاپور فلپائن اور مشرق بعید کے دیگر ممالک میں پھیلا ہوا ہے، اسی مدرسے میں گھر کا کام نہ کرنے پر ہاتھوں پر سوٹیاں کھاتا رہا۔ اسی سکول سے چودھری سراج الحسن پڑھا جس نے آڑھت کی اک چھوٹی سی دکان کو کاٹن انڈسٹری میں بدل ڈالا۔ یہیں سے حافظ منور حسین ضیاء قادری نے مہربان اساتذہ کی ماریں کھا کھا کر تعلیم حاصل کی اور بہاولپور ڈویژن میں صحافت کو نئے رخ عطا کرنے والی ٹیم کا سرخیل بنا...... یہ وہ وقت تھا جب ''کالے انگریزوں'' کا اثر ونفوذ زیادہ نہیں ہوا تھا۔ تعلیمی پالیسی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اساتذہ نفسیات نہیں پڑھے ہوئے تھے اور والدین اساتذہ کو ''تنخواہ دار ملازم'' نہیں سمجھتے تھے۔ تعلیم کے موضوع پر ''تھوتھے چنے''، اخباروں، ٹیلیویژن، ریڈیو اور دوسرے میڈیاز پر بقراطیاں نہیں جھاڑتے تھے۔ علم کی خدمت خاموش تھی جس میں ہر شخص بقدرِ بساط جتا ہوا تھا۔ افسوس کہ آج اگر ایام گذشتہ کی اُن مثالی درسگاہوں کے واقعات سنائے جائیں تو نسل نو انہیں دیو مالائی قصے سمجھ کر سنتی ہے۔ ایک بے اعتباری اور غیر یقینی ان کے چہرے سے ٹپک رہی ہوتی ہے۔

مجھے اتنی لمبی رام لیلا کیوں لکھنی پڑی۔ میں تعلیمی پالیسیوں پر لکھنے بیٹھا تو مجھے اپنا مدرسہ رفیق العلماء بہت یاد آیا۔ پیارے قاری! میں خدا کو حاضر ناظر جان کر یہ لفظ لکھ رہا ہوں۔ کہ جب تک میں اپنے مدرسے کی یادیں لکھتا رہا، میری آنکھوں میں ساون کی جھڑی لگی رہی۔ میں بار بار اپنی عینک صاف کرتا رہا۔ مدرسہ رفیق العلماء صادق آباد سے نکل کر میں انگلش میڈیم تعلیم کی دنیا میں کھو گیا۔ پنجاب یونیورسٹی کی حدوں کو عبور کرتے

Marfat.com

ہوئے پاک آرمی میں ذمہ دار عہدوں پر کام کرتا رہا۔لیکن ان تمام مراحل میں میری دستگیری اسی درس نظامی والے مدوسے نے کی۔آج اس بوڑھاپے کی دہلیز پر جب پیچھے مڑکر دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ میری شخصیت کو چند ہاتھوں نے بہت اونچا تھام رکھا ہے اور یہ ہاتھ انہی بوسیدہ پوش، پراگندہ حال، قلیل مشاہیرہ (Low Paid) والے عظیم المرتبت لوگوں کے ہاتھ ہیں دراصل میں سوچ تو رہا تھا ان حرماں نصیب نوجوانوں کے تاریک مستقبل کے بارے میں جو ہماری بے سمت تعلیمی پالیسیوں کے طفیل تباہ و برباد ہو رہا ہے لیکن غم کے لمحوں میں اچھے وقت یاد آتے ہیں تو بہت رلاتے ہیں۔ مجھے مدرسہ رفیق العماء اور اس کے اساتذہ یاد آئے تو سیلاب کے بند ٹوٹ گئے۔

آزادی کو انسٹھ (59) سال گذر گئے۔اس عرصے میں اک نسل جوان ہو کر اکثریت رزق خاک ہو چکی۔ ہم نے زندگی کا کوئی چلن زندہ قوم کی طرح نہ اپنایا۔ سیاست، معیشت اور تعلیم کوئی بھی ایسا شعبہ نہیں کہ جس پر ہم فخر کر سکیں۔ مسلسل زوال ہے جس کی طرف ہم آئے دن بڑھ رہے ہیں۔ تعلیم تو اک ایسا شعبہ ہے جس کے اثرات براہِ راست نسل نو پر پڑتے ہیں جنہیں آگے چل کر اس ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہوتی ہے۔ اس ملک عزیز میں نوطرح کے نظام ہائے تعلیم چل رہے ہیں۔ ایچیسن کالج، لارنس کالج اور ان کی سطح کے دوسرے تعلیمی ادارے حکومت پاکستان کے خواب و خیال سے بہت آگے ہیں اور نا قابلِ دست اندازی۔ دوسرے نمبر پر بیکن ہاؤس، فاربل، سٹی فاؤنڈیشن اور دوسری تعلیمی تنظیمیں ہیں جو ''برگر'' اور ''باجیاں'' قسم کے شہری تخلیق کر رہے ہیں۔فوج کے اپنے تعلیمی ادارے، اپنا نصاب اور اپنی فائنل اتھارٹی ہے۔ یہ کچھ اور بنا رہے ہیں۔ پھر پرائیویٹ سکولوں کی بھر مار ہے جو دونوں ہاتھوں سے مظلوم والدین کو لوٹ رہے ہیں۔ یہ وہ ادارے ہیں جو اعلیٰ پوسٹ گریجوایٹ لڑکیوں کو انتہائی قلیل (دو ہزار روپیہ ماہانہ) تنخواہ پر ملازم رکھ کر پانچ ہزار روپے ماہانہ کی پیرول پر دستخط کرا لیتے ہیں۔ بے

Marfat.com

روزگاری سے لاکھوں روپے کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ایسے ادارے جرائم کے اڈے بنتے جا رہے ہیں۔ ایک ان پڑھ اور غیر تعلیم یافتہ شخص مشکل سے نام والا نام نہاد انگلش میڈیم سکول کسی محلے میں کھول لیتا ہے۔ اور پھر تعلیم کے نام پر یہاں بہت کچھ ہوتا ہے۔

- بڑے شہروں میں گورنمنٹ سکولز اور کالجز ہیں جہاں پر تعلیم کے کچھ آثار نظر آتے ہیں۔ شائد اُسکی وجہ یہ ہے کہ یہ ادارے براہِ راست افسرانِ بالا کی نظر میں ہوتے ہیں اور آتے جاتے کوئی حاکم اعلیٰ ٹپک سکتا ہے۔ یہاں داخلوں کا میرٹ اتنا ہائی ہوتا ہے کہ دور دراز پسماندہ علاقے سے آنے والا بچہ یہاں داخلے کا سوچ ہی نہیں سکتا۔

- یونیورسٹی کی سطح پر عجب لٹ مچی ہوئی ہے۔ پڑھانے والا اُستاد ہی پرچہ بناتا ہے اور پھر وہی خود پرچہ مارک کرتا ہے۔ چنانچہ سفارش، دھونس دھاندلی، دباؤ اور لالچ جیسی وباء عام ہے۔ شعبہ کے سربراہ کی کوشش ہوتی ہے کہ تمام کے تمام طلباء اے گریڈ میں پاس کر جائیں۔ چنانچہ اساتذہ کو دبے الفاظ میں ''ہتھ ہولا'' رکھنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ اگر کوئی قسمت کا مارا، مصلحت نا اندیش اور ضمیر کا قیدی ان اشاروں کنایوں کو نہ سمجھ پائے تو اس کی کلاس تبدیل کر دی جاتی ہے۔ وہ کیا دور تھا کہ پڑھاتا کوئی ہے، پرچہ کوئی اور بناتا ہے اور پرچہ دیکھنے والا اور استاد ہوتا تھا۔ ایک طالب علم کڑی جانچ پڑتال کی کٹھالی میں سے کندن بن کر نکلتا تھا آج سیکریسی برانچوں کے کلرک کروڑ پتی ہیں۔ اس وقت سیکریسی برانچ کی لوکیشن کا کسی کو علم نہیں ہوتا تھا۔

- بڑے بڑے بورڈ (Curricuilum) کے نام پر بٹھائے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے سبجیکٹ سپیشلسٹ اکٹھے ہوتے ہیں۔ اپنی تجربہ کار رائے کے لئے بھاری معاوضے وصول کرتے ہیں۔ لیکن حالت یہ ہے کہ دس بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر رہنے والے بچے کو ہم آج بھی رسے ریل پڑھا رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ ریل کی شکل اس کے والدین نے بھی نہ دیکھی ہو۔ ہمارے یہ ماہرین انگریزی کا تو ویسے بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے

Marfat.com

البتہ اردو میں کسی حرف کے آخر میں آنے والی ''ہ'' کو''الف'' میں تبدیل کر دیتے ہیں تو کہیں بڑی ے کے اوپر پڑے ''ء'' کو ہٹا کر ''ے'' کے نیچے دو نکتے ڈال دیتے ہیں۔ دُور دراز کسی پسماندہ گاؤں کے اس معصوم بچے کے ہاتھ کیا آیا، جو آج بھی کسی درخت کے سائے کے نیچے چٹائی پر بیٹھا ''اب پ'' تختی پر لکھ رہا ہے اور اپنے نصیب کو رو رہا ہے۔ وزیر تعلیم سے لے کر گریڈ 22 کے افسر اور پی ٹی سی استاد سے لے کر ایک چپڑاسی تک محکمہ تعلیم کا ہر فرد اسی معصوم بچے کے نام پر زندگی کے سارے مزے لوٹ رہا ہے، جسے تعلیم کے لئے چار دیواری میسر ہے نہ بیٹھنے کے لئے سایہ دار جگہ، کتابیں رکھنے کیلئے ڈسک میسر ہے نہ کتابیں...... ایک ایسے وزیر تعلیم بھی آئے جنہوں نے اپنے صوبے میں تمام سکولوں کے باہر کچھ اس طرح کے لفظ لکھوا دیئے۔ ''آیئے اور دیکھئے کہ ہم تعلیم کے لئے کیا کر رہے ہیں'' کچھ منچلے تعلیم کا حال دیکھنے کے لئے گرلز سکول جا پہنچے۔ اس دن سے زنانہ تعلیمی اداروں سے یہ بورڈ ہٹا لئے گئے اور جس دن وہ وزیر رخصت ہوئے راتوں رات صوبے بھر سے بورڈ غائب ہو گئے۔

پوری دنیا میں پالیسیاں کسی چلتے ہوئے نظام کی خامیوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد اصلاح کے لئے بنائی جاتی ہیں۔ یہ کیسا ملک ہے کہ اس میں آج تک کسی بھی شعبہ کے لئے جب کبھی پالیسی بنی اس نے صورتِ حال کو مزید ابتر کیا۔ دراصل وزراء ہوں یا سیکرٹری ہر بڑا آدمی اپنے سے بڑے آدمی کی ''گڈ بکس'' میں رہنا چاہتا ہے۔ پالیسی پیش کرنا ان کے ہاتھ میں اپنے سینئر کی خوشنودی حاصل کرنے کا ایک پروجیکٹ ہوتا ہے۔ خوبصورت غلافوں میں لپٹا ہوا، آرٹ پیپر پر چھپا ہوا، فلاوری یعنی لچھے دار انگریزی میں لکھا ہوا ڈرافٹ جب بڑے صاحب کی میز پر پہنچ جاتا ہے۔ تو سمجھو ان کی محنت ٹھکانے لگ گئی اور صاحب کی نظروں میں ان کی قابلیت کا گراف اونچا ہو گیا۔ صاحب گئے تو ساتھ پالیسیاں بھی گئیں۔ نئے صاحب آئے تو اپنے ساتھ عملہ بھی اور لے آئے۔ پھر وہی

Marfat.com

نوکری بازی، ذاتی پروجیکشن اور خوشنودیٔ شاہ کا نیا چکر شروع ہو گیا۔ اس ملک کی کتنی بڑی بدقسمتی ہے کہ آج تک کسی ماہر تعلیم اور نیک نام شخص کو وزارتِ تعلیم کا قلمدان نہیں دیا گیا۔ اگر غلطی سے کبھی کوئی ایک آدھا جو ہر قابل اس طرف آ ہی گیا۔ تو اسے کام نہیں کرنے دیا گیا بیوروکریسی اس کے راستے میں دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔ نتیجتاً یا تو وہ بے بس ہو کر بیٹھ گیا، یا آنوں بہانوں سے فارغ کرا دیا گیا۔ پاکستان کے ابتدائی دس سالوں میں یا کچھ زیادہ لارڈ میکالے کے نظام تعلیم کو خوب جی بھر کے کوسا گیا کہ اس شخص کے سازشی ذہن کی پیداوار یہ نظام تعلیم صرف کلرک اور بابو پیدا کر سکتا ہے۔ اور ہمیں ہر صورت میں اِس نظام کو تبدیل کرنا ہوگا۔ ان ارباب بست وکشاد سے کوئی پوچھے کہ اس نے کم از کم بابو اور کلرک تو پیدا کئے، آپ نے پچاس سال میں اس قوم کو کلرک پیدا کرنے کا بھی نہ چھوڑا۔ میکالے کے نظام تعلیم میں مڈل کے امتحان میں بیٹھنے والا طالب علم انگریزی کے آٹھ مضمون (Essays) اور بارہ طرز کی درخواستیں (Applicaitons) یاد کر کے بیٹھتا تھا۔ آج کسی ایم اے کے طالب علم سے کہئے کہ ایک غلطیوں سے مبرا چار لائنوں کی انگریزی درخواست تو لکھ دے۔ لارڈ میکالے کے نظام کو مار کے ہم اپنا کوئی نظام تعلیم نہ لا سکے سیمسٹر سسٹم متعارف کرا کے ہم نے بڑا تیر مارا۔ اس نئے نظام سے پیدا ہونے والی خامیوں کا تذکرہ کیا جائے تو دفتر بھر جائیں۔ دنیا کا ہر بڑا ملک عوام کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کے لئے امداد دیتا رہا ہے اور آج بھی اس مد میں ہماری مدد کرنے کو تیار ہے۔ ہم اپنا کشکول آگے بڑھا دیتے ہیں۔ سائنس کی یونیورسٹیاں کھلتی چلی جا رہی ہیں۔ علاقائی تعلیمی بورڈ کھمبیوں کی طرح پیدا ہو رہے ہیں۔ بڑے شہروں میں سکولوں کالجوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ میڈیا میں تعلیمی سرگرمیوں کے ڈھول بھی پیٹے جا رہے ہیں۔ ٹیلیویژن کی سکرین پر معنک دانشور بچے بھی بٹھائے جا رہے ہیں جو اپنے قبیل کی آبادی کا صرف ایک فیصد ہیں۔ درختوں کی چھاؤں میں خالی زمین پر بیٹھ کر تختی لکھنے والے بچے کا حال

Marfat.com

اور مستقبل آج بھی تاریک ہے۔ دُور دراز کے دیہاتوں میں جا کر میں نے مشاہدہ کیا ہے کہ ایک چھپری کے تلے سکول قائم ہے۔ بچے صبح سویرے آ کر جمع ہو گئے ہیں اور اکلوتے استاد جی کی آمد کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ اگر گھنٹے ڈیڑھ میں استاد پہنچ گیا تو ٹوٹے ہوئے موڑھے پر بیٹھ کر تھوڑا پڑھا لیا اور اگر گھنٹے ڈیڑھ میں موصوف تشریف نہ لائے تو بچے بستے اٹھا کر اپنے گھروں کو سدھارے اور محترم استاد جی کا یہ رویہ کہ ہفتے میں صرف دو دن آتے ہیں۔ اوپر آفس میں اپنی تنخواہ کا 1/4 حصہ یہ دیتے ہیں اور اپنے گاؤں میں کریانے کی دکان چلاتے ہیں۔ اپنی سینئر، ٹی کی وجہ سے دس ہزار تنخواہ پاتے ہیں اور ابھی سروس کے سات سال باقی ہیں۔

کہاں ہو رہنماؤ بڑا اندھیرہ ہے
سیاہیوں کے خداؤ بڑا اندھیرہ ہے

چلتے چلتے تعلیم کے حوالے سے اپنی سچی آپ بیتی پیش کر رہا ہوں۔ آج سے بارہ تیرہ سال قبل میں ڈیرہ اسمٰعیل خان میں تعینات تھا۔ میری بیٹی نے پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان دیا۔ گزٹ آیا تو وہ اچھے نمبروں سے پاس تھی۔ دو ماہ انتظار کیا، اُس کا ڈی ایم سی نہ ملا۔ میں لاہور متعلقہ آفس پہنچ گیا۔ ڈپٹی صاحب سے ملا۔ انہیں صورتِ حال بتائی۔ انہوں نے متعلقہ کلرک کو انٹر کام پر بتایا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کلرک بادشاہ چھ سات اعتراضات کی لسٹ لے کر آ گئے۔ ایسے ایسے غیر معقول اعتراضات کہ میں سر پیٹ کے رہ گیا۔ ان اعتراضات کو رفع کرتے کرتے اک زمانہ لگنا تھا۔ ناچار میں پریشانی میں دفتر سے باہر نکلا بچی کا مستقبل تاریک ہو چکا تھا۔ آگے داخلہ ممکن نہیں رہا تھا۔ اسی سوچ میں تھا کہ پیچھے سے اک شخص آیا۔ اس نے ایک پرچی مجھے پکڑاتے ہوئے کہا ''شام پانچ بجے اس پتہ پر آ جائیں۔ کام ہو جائے گا''۔ میں شام کو صدر میں پان فروش کے کھوکھے پر پہنچا تو وہی شخص موجود پایا۔ وہ میرے ساتھ ہو لیا۔ اک گلی میں داخل ہوتے

Marfat.com

ہوئے اس نے ہدائت کی کہ میں اپنی شناخت نہ کراؤں۔ اس نے ایک دروازے پر دستک دی اور میری بیٹی کے کوائف مجھ سے لے لئے۔ باہر آنے والے صاحب کو وہ ایک طرف لے جا کر جانے کیا کچھ کہتا رہا۔ واپس آیا تو مجھے کہنے لگا ''آپ کل شام کو کھوکھے پر تشریف لے آئیں۔ ایک ہزار روپیہ اور دو کلو مٹھائی کا ڈبہ ساتھ لیتے آئیں''۔ وہاں سے رخصت ہوا۔ ضمیر پر بڑا بوجھ تھا۔ حکومت کا ایک ذمہ دار اہلکار ہوتے ہوئے مجھے رشوت دینے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ ذہن میں خیال آیا کہ محکمہ انسداد رشوت ستانی سے بات کروں۔ لیکن ان سے کیا کہوں۔ رشوت کے لین دین میں ''مڈل مین'' کوئی سرکاری ملازم نہیں تھا۔ بالفرضِ محال اگر رشوت خور پکڑے جاتے ہیں۔ میری بیٹی کا ڈی ایم سی تو نہیں ملے گا۔ اور اعتراضات کی زد میں آ کر اُس کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ میں نے رشوت دینے کا فیصلہ کر لیا دوسری شام میں پان کے کھوکھے پر پہنچا تو وہ صاحب ایک خوبصورت فائل میں ڈی ایم سی لئے بیٹھے تھے میں نے ہزار روپیہ اور مٹھائی کا ڈبہ اسے دیا اور مطلوبہ کاغذ لے کر آ گیا۔ یہ ہے ہماری تعلیم کی کہانی اپنے ساتھ یا بعد میں آزاد ہونے والی قوموں پر نظر ڈالتا ہوں تو غالب یاد آ جاتے ہیں۔

ایک ہم ہیں کہ ہے لی اپنی ہی صورت بھی بگاڑ
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

Marfat.com

عورت اور سادگی

یہ کائنات کیا ہے؟ ذروں سے لے کر چاند ستاروں اور زمین سے لے کر آسمان تک تخلیق کا ایک بکھرا ہوا سلسلہ ہے جو ایک واضح سلیقے اور ترتیب کے ساتھ صبح وشام کے متعین کردہ نظام کے اندر چل رہا ہے۔ اس کائنات کے کیسے کیسے تہہ در تہہ پہلو ہیں جو آج بھی انسان کی تمام تر ترقی کے باوجود اس کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ اگر ذرا غور کیا جائے تو ایک ناقابل یقین حقیقت ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے کہ کائنات کے اس مروجہ نظام کا ایک ایک ذرہ اور ایک ایک لمحہ اس طرح سے تنظیم کے عمل میں پرو دیا گیا ہے کہ اگر ایک ذرے کو اپنی جگہ سے اِدھر اُدھر کے دیا جائے تو اس نظام کی ساری کڑیاں منتشر ہو جائیں، بکھر کر رہ جائیں کائنات کا پورا وجود کچی دیوار کی طرح دھڑام سے زمین بوس ہو جائے لیکن لطف کی بات یہی ہے کہ فطرت کے ہاتھوں ترتیب پانے والے اس نظام کا ایک ذرہ بھی آج تک اپنے مرتب شدہ مقام سے دائیں بائیں کبھی نہیں ہوا۔ ازل سے یہ سلسلہ شروع ہوا ہے اور ابد تک اسی طرح جاری رہے گا۔ انسان بے شک ستاروں پر کمندیں ڈالتا رہے کائنات کی وسعتوں کو ہاتھ ڈالتا رہے مگر قانون قدرت سے ہمیشہ خائف رہے گا۔ اور خداوندی نظام سے پنجہ آزما ہونے کی کوشش کبھی نہیں کرے گا۔ جب یہ بات طے ہے کہ قانونِ قدرت ایک خاص سلیقے کا بے عیب اصولی نظام ہے تو جہاں کہیں بھی اس اصولی نظام کی ذرہ سی خلاف ورزی ہوئی، انسانیت بھٹک گئی اور گمراہ ہو گئی۔ ایک چھوٹی سی مثال میں نباتات کے حوالے سے دیتا ہوں۔ ویران جنگلوں کی اپنی ایک ہیبت اور جلال ہوتا ہے۔ ان جنگلوں میں گھنے ببول کے درخت، خاردار جھاڑیاں،

Marfat.com

بھانت بھانت کے جانوروں اور پرندوں کی بولیاں اور ہر طرف چھائی ہوئی ایک گونہ خاموشی اچھی لگتی ہے۔ کیونکہ جنگل کا یہ منظر فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اس بھرے جنگل میں گلاب کے پودے یا سرو دسمن کے بوٹے اس لئے اچھے نہیں لگیں گے کیونکہ یہ صورت حال فطرت کے خلاف ہے گلاب، چنبیلی اور موتیا کے مہکتے ہوئے چمن میں اگر ایک درخت ببول کا اُگا دیا جائے تو وہ کیسا لگے گا۔ یا کماد کی فصل میں چنبیلی کے پودے لگا دیئے جائیں تو بھلا کیا محسوس ہوگا۔ یہ قانونِ فطرت کے خلاف ایک غیر متوقع صورت حال ہوگی اور ذہن اسے کبھی قبول نہیں کرے گا۔ آیئے اب نباتات کی دنیا سے انسانوں کی دنیا کی طرف چلیں۔ انسان قدرت کا سب سے بڑا شہکار ہے۔ اس کی خاطر پوری کائنات کی بساط بچھائی گئی اور اسے خدا کا نائب کہہ کر پوری کائنات کا تمام تر جمال اس کے لئے وقف کر دیا گیا۔ مرد اور عورت قانون فطرت کی تخلیق ہیں اور پھر ان دونوں میں سے عورت خداوندی کمالات کی معراج ہے۔ مرد بیٹا، خاوند اور باپ ہو کر بھی مرد رہتا ہے۔ اس کے کردار کی خصوصیت ان تین مختلف خانوں میں تقسیم ہو کر بھی ایک جیسی رہتی ہیں۔ ان خصوصیات کی نوعیت تبدیل نہیں ہوتی۔ مگر عورت کی عظمت یہ ہے کہ وہ بیٹی، بیوی اور ماں کے روپ میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے پیار و محبت، وفا اور ایثار و قربانی کا پیکر بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ آج بھی ہمارے معاشرے میں جس گھر میں بیٹی نہ ہو تو اسے بد نصیب گھر کہا جاتا ہے۔ آج بھی سگھڑ لڑکی جس گھر میں دلہن بن کر جاتی ہے۔ اس گھر کو جنت اراضی کا نمونہ بنا دیتی ہے آج بھی ملک کا ہر نوجوان اپنے عزم و عمل کی توانائی اپنی ماں کی دعاؤں سے حاصل کرتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ اپنی عظمتِ کردار کی وجہ سے عورت مرد سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہے۔ دنیا میں آج تک جتنے بھی سچے مذہب آئے ہیں انہوں نے عورت کے وجود کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور بنی نوعِ انسان کو صنف نازک کے احترام کا سبق دیا ہے۔ بلاوجہ تو نہیں کہا جاتا کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔ علامہ اقبال نے

Marfat.com

بلا جواز تو نہیں کہا تھا۔

وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ

جس طرح میں نے جنگل کی مثال دی ہے اور اس کے ساتھ ان لوازمات کا ذکر بھی کیا ہے جن کے بغیر جنگل کا تصور ہی قائم نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح عورت کے کردار کی عظمت بھی کچھ تقاضے کرتی ہے۔ اگر وہ تقاضے پورے نہ ہوں تو پھر اس عظمت کا تصور بھی ذرا دھندلا پڑ جاتا ہے۔ جیسے جنگل کے جاہ و جلال میں ایک کردار اس سکون پرور خاموشی کا ہوتا ہے جو ہر طرف چھائی محسوس ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح عورت کی عظمت کا ایک راز اس کی سادگی میں پنہاں ہوتا ہے فطرت کے وہ چند قوانین جن کی بدولت عورت کو اس کائنات کی عظیم ترین مخلوق کہا جاتا ہے ان میں سے ایک قانون عورت کی پروقار سادگی ہے۔ اگر یہ سادگی نہ ہو تو عورت کا وجود ایسے ہی لگتا ہے۔ جیسے ویران جنگل میں جھاڑیوں کے اندر موتیا کی بیل یا جیسے گلاب کے چمن زار میں ببول کا کوئی درخت قوانین قدرت میں سے ایک قانون بھی اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو کائنات کا کارخانہ رک جاتا ہے سادگی عورت کے ساتھ منسوب ایک قانونِ فطرت ہے جب اس فطرت کو عورت سے جدا کر کے دیکھا جائے گا تو عورت اپنے اعلیٰ و ارفع مقام سے گر جائے گی۔ میرے اس دعویٰ کا ثبوت تاریخ فراہم کرتی ہے۔ دنیا کا کوئی مذہب اُٹھا کر دیکھ لیجئے۔ جہاں ایک طرف الہامی کتابوں اور مذاہب نے معاشرے میں عورت کی اہمیت اور مقام کو تسلیم کیا ہے وہاں عورت کو بھی پند و نصائح سے نوازا ہے اُسے شرم و حیا کی تلقین کی ہے۔ اور شرم و حیا دراصل وہ سرچشمے ہیں جن سے عورت کی عظمت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ ایک مسلم حقیقت ہے کہ جس عورت کی آنکھ میں شرم و حیا کی لالی ہو گی وہ فیشن، خود پرستی اور دکھاوے جیسی لعنتوں سے کوسوں دور ہو گی کنفیوشش، گوتم بدھ، زرتشت، حضرت عیسیٰ اور نبی برحق ﷺ تک جتنے بھی دانائے راز اس دُنیا میں آتے رہے، انہوں نے اپنے اقوال

Marfat.com

میں شرم وحیا کے ظاہری وباطنی فوائد گنوائے۔ یہاں ایک سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ ہر مذہب کیوں عورت کے تقدس اوراس کی معاشرتی اہمیت کو دہراتا رہا اوراس نصیحت کے باوجود ہر دور میں عورت سے منسوب سماجی برائیاں کیوں وقوع پذیر ہوتی رہی ہیں؟ عورت کے ساتھ زیادتیوں کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ انسانی تہذیب کی تاریخ ہر دور میں گم کردہ راہ معاشرہ بے راہ روی کی اس کیفیت کو پہنچتا رہا کہ شرفاء بدنامی کے خوف سے اپنی بیٹیاں زندہ زمین میں گاڑھ دیتے رہے۔ عورت ایک کھلونا تھی تو فیشن پرستی نے جنم لیا۔ پہلے اسے مرد اپنی نفسانی خواہشات کی تسکین کے لئے سنوارتا بناتا رہا۔ اور جب سنورنا بننا ایک روایت بن کر تاریخ کا حصہ ہوگئی تو پھر ملکہ صبا اور قلوطرہ جیسی عورتوں نے جنم لیا۔ قلوطرہ کا نام آج بھی نفرت سے لیا جاتا ہے کہ عورت ذات ہو کر اس نے قانونِ قدرت سے ٹکر لینے کی کوشش کی۔ اور نتیجتاً تاریخ میں ہمیشہ کے لئے راندۂ درگار ہو کر عورت کے اعلیٰ مقام سے گر کر قعرِ ذلت میں جا گری۔ عورت کے جب چار روپ بیٹی، بہن، بیوی اور ماں کی صورت میں قربانی، ایثار، وفا اور سراپا دعا بن کر آتے ہیں تو پھر ایسی کوئی بھی حرکت عورت ذات کو زیب نہیں دیتی جس سے اس کی عظیم شخصیت کا پندار مجروح ہوتا ہو۔ اور ویسے بھی کہا گیا ہے۔

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی

اب آیئے ذرا معاشرے کے حوالے سے عورت کے ساتھ سادگی کے لازم و ملزوم رشتے کا ایک جائزہ لیں ماں کی گود بچے کا پہلا مکتب ہے۔ جب وہ آنکھ کھولتا ہے تو اس عالم رنگ و بو میں جو پہلی شخصیت اس کی تعلقدار بنتی ہے، وہ عورت ہوتی ہے۔ چنانچہ نیا وجود پانے والا انسان جس ہستی سے پہلے متاثر ہوتا ہے، وہ ہستی اس کی ماں یعنی عورت ہوتی ہے۔ انسانی جبلت اور نفسیات کا ایک تقاضا ہے کہ بچہ جس انسان کے زیادہ قریب رہے گا۔ اس کے اثرات سب سے زیادہ قبول کرے گا۔ اگر عورت اپنی اولاد کی تربیت

Marfat.com

اوائل عمری میں صحیح نہ کر سکے تو وہ معاشرے اور قوم کی گنہگار ٹھہرتی ہے۔ تربیت کے یہ لمحے بڑے کٹھن اور مشکل ہوتے ہیں۔ عورت کو بے پناہ ایثار کرنا پڑتا ہے۔ ہزاروں خواہشیں مارنی پڑتی ہیں اور اپنے رویئے اور روزمرہ معمولات میں ایک ایسی مثالی صورت حال پیدا کرنی پڑتی ہے کہ ایک ساعت کے لئے بھی وہ بچے کی پرورش اور تربیت کے خیال سے غافل نہ ہو۔ سادگی وہ بنیادی رویہ ہے جو کردار کا مرکزہ بنتا ہے۔ سادگی آجانے سے عورت میں وقار کا عنصر فزوں تر ہو جاتا ہے اور اسی وقار کے مثبت اثرات بچے کے ذہن پر خوشگوار تاثر چھوڑتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کے وہ گھرانے دراصل سماج کے بیمار گھرانے ہیں جہاں بچہ پیدا ہوتے ہی ارد گرد فیشن کے امڈے ہوئے طوفان دیکھتا ہے۔ وہ ماں کے بجائے ماماؤں کے ہاتھوں میں پل کر جوان ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا بدنصیب بچہ بڑا ہو کر نہ صرف سوسائٹی کا ایک بیمار فرد بنتا ہے بلکہ ماں جیسے مقدس رشتے سے واقف نہ ہونے کی بنا پر اپنی ماں سے زیادہ اس غریب نوکرانی کی عزت کرتا ہے جس نے اسے بچپنے میں پالا پوسا ہوتا ہے۔ اب وہ بدقسمت بچہ جسے ماں کے محض فیشن اور سوسائٹی میں ماں کی بے پناہ سوشل مصروفیت کی وجہ سے مامتا کی گرم گود نصیب نہ ہوئی ہو بھلا اپنی قوم کے بالخصوص اور معاشرے کے بالعموم فوائد کے لئے صحت مند سوچ کہاں سے پیدا کرے گا بجائے اس کے کہ وہ معاشرے کے کھولتے ہوئے مسائل کو حل کرنے کے لئے دوسرے ہمعصر شہریوں کو اپنے ساتھ ساتھ عمل کی طرف کھینچے، خود معاشرے پر بہت بڑا بوجھ بن جائے گا۔ جہاں ماں کی جھولی مامتا کی گرمی سے محروم ہو جائے وہاں نازک وقت اور زندگی کے مشکل مراحل پر اس کی دعاؤں کی تاثیر بھی ختم ہو جاتی ہے۔ ہمارے معاشرے کے وہ نام نہاد بڑے گھرانے جہاں فیشن کی دنیا آباد ہو ظاہری کروفر کے باوجود اندر سے کھوکھلے ہو چکے ہوتے ہیں۔ وہاں بیٹے کو باپ کا اور بیٹی کو ماں کا ذرا بھر پاس ادب نہیں ہوتا۔ ہر شخص اپنی دنیا میں مگن ہوتا ہے۔ اور اس کی شخصیت کی

Marfat.com

چار دیواری ہی صرف ذاتی ضرورتوں اور ذاتی دلچسپیوں تک محدود ہوتی ہے۔اس سارے بگاڑ کی ذمہ دار عورت ہے جسے اس گھر میں ماں کا عظیم کردار کرنا ہوتا ہے مگر وہ اپنے منصب سے انصاف کرنے میں ناکام ہی ہوتی ہے۔اگر وہ دنیا دار عورت بن کر فیشن کے گہرے سمندر میں غوطہ زن نہ ہوئی ہوتی تو اس کے کردار اور عمل کی مہک گھر کے ایک ایک کونے میں پھیلی ہوئی ہوتی۔اس کے بچے اور گھر کے دیگر افراد اس کے وقار، ایثار اور قربانی سے مرعوب ہو کر گھر کی وضعدار روائتوں کو توڑنے کی جرأت نہ کر سکتے مغرب کا معاشرہ دیکھ لیں۔آپ کو محسوس ہوگا کہ بظاہر تمدن کی چکا چوند اور مادی ترقی کے باوجود وہ معاشرہ اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہے۔اس معاشرے کا ہر حساس فرد زندگی سے فرار کے راستے تلاش کرنے میں لگا رہتا ہے۔منشیات کا استعمال اسی فرار کی ایک صورت ہے۔ علاوہ ازیں وہاں پر ہپی ازم، ہرے راما ہرے کرشنا تحریک اور سوامی جی کے چیلوں کی وبا طاعون کی طرح پھیلی ہوئی ہے اہل مغرب اس معاشرتی بے راہ روی کی توضیحات کچھ بھی کریں ان کے ذہنوں میں بہرحال یہ چور چھپا ہوا ہے کہ وہاں عورت کو جمہوری آزادی تو دی گئی مگر اس کی روحانی آزادی فیشن کا کھلونا اس کے ہاتھ میں دے کر اس سے چھین لی گئی۔بھٹکی ہوئی عورت بھلا معاشرے کو اچھے شہری کہاں سے دے سکتی ہے۔ مغرب میں جب بچہ ہوش سنبھالتا ہے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اس میں پیدا ہوتی ہے تو وہ اپنے والدین کے درمیان اختلافات کی خلیج حائل دیکھتا ہے۔پھر یہ خلیج وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ گہری ہوتی چلی جاتی ہے۔اگر ان مضمرات کا جائزہ لیں جو اختلاف کی بنیاد بنتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عورت بحیثیت عورت کے اپنے عظیم کردار سے واقف نہیں ہے۔اگرچہ فیشن کے سیلاب نے آج مشرقی عورت کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ لیکن اس وقت کو گذرے زیادہ عرصہ نہیں ہوا جب پہلی لڑکی کے پیدا ہوتے ہی ماں سر پر سفید دوپٹہ اوڑھ لیتی تھی اس سفید دوپٹہ اوڑھ لینے کے عمل میں بھی ایک گہرا فلسفہ موجود

Marfat.com

ہوتا تھا۔ اپنی وضع قطع میں کلی وقار پیدا کر لینے کا نقطۂ آغاز تھا یہ عمل اور بچے کے لئے مثال کی نفسیاتی ٹریٹ منٹ یہ تھی کہ آنکھ کھولتے ہی اُسے سادگی اور وقار کے ایک مرقع سے واسطہ پڑے۔ شوخ و شنگ کپڑوں کے رنگ اور فیشن کی بے جواز چمک اس کی معصوم آنکھوں کو خیرہ نہ کر سکے۔ آج بھی بڑے گھرانوں میں ایک خاندانی ریت موجود ہے کہ جہاں گھر میں بڑی بوڑھیاں موجود ہیں، وہاں نئی روشنی کے در آنے کے باوجود ان بزرگ عورتوں کا احترام ہوتا ہے۔ چھوٹے بڑے سب ان کا احترام کرتے ہیں۔ ان کے سامنے لڑکیاں، بالیاں اپنے سر دوپٹے سے ڈھانپ لیتی ہیں اور نوعمر لڑکے کھلنڈرے پن کی ساری چوکڑیاں بھول جاتے ہیں۔ معاشرہ مغرب کا ہو یا کہ مشرق کا انسانی نفسیات کی بنیادیں یکساں رہتی ہیں۔ جب عورت کی آنکھ میں شرم وحیا موجود تھی اور پروقار سادگی اس کا وطیرہ تھی تو عورت نے کیسی کیسی تاریخ ساز ہستیوں کو جنم دیا تھا۔ کیسے کیسے نامور لوگ پیدا ہوئے تھے۔ جنہوں نے انسانی تاریخ کا رخ موڑ کر رکھ دیا تھا۔ ہم دوسری قوموں کی بات کیوں کریں۔ اپنے اندر جھانک کر سچ کی بات کیوں نہ کہیں۔ ہم مسلمان آج بھی ہیں۔ کلمہ ہم آج بھی پڑھتے ہیں۔ محمد عربی ﷺ کی اُمت ہم آج بھی کہلواتے ہیں۔ مگر آج ہم میں خالد بن ولید، محمد بن قاسم، طارق بن زیاد اور صلاح الدین ایوبی کیوں پیدا نہیں ہوتے ذرا غور کیجئے، وہ ہستی جس نے ماں بن کر ان فرزندوں کی پرورش کی، آج اپنے فطری کردار سے محروم ہوئی ہے۔ قانونِ قدرت کے اس انحراف سے مسلمان معاشرے کی عظیم الشان عمارت منہ کے بل آ گے گر گئی ہے۔

اگلے وقتوں میں لوگ بڑی لمبی عمریں پاتے تھے۔ سو سال کی عورتیں اور مرد بھلے چنگے چاک و چوبند ہوہوتے تھے۔ آج ہمارے ماہرین طب کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ماضی کے لوگوں کی لمبی عمر کا سب سے بڑا سبب ان کی سادہ غذا اور سادہ رہن سہن میں پوشیدہ تھا۔ ان کی ضرورتیں محدود تھیں اور ان ضرورتوں کے حصول کے لئے انہیں زیادہ

Marfat.com

جدو جہد اور فکر کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ چنانچہ پریشانیاں کم ہونے کی وجہ سے ذہنی سکون انہیں حاصل رہتا تھا۔ یہ بات ثابت کرتی ہے کہ سادگی زندگی کا ایک صحت مند راز ہے۔ سادہ غذا اور سادہ وضع قطع سے انسان خدا کی عطا کردہ صحت کا لطف اٹھا سکتا ہے۔ سادگی انسان میں حقیقت پسندی اور سچ گوئی جیسی صالحہ عادتیں پیدا کرتی ہے۔ سادہ رہنے والی عورت کے ذہن میں یہ کبھی خیال پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اپنی ہجولیوں کو مرعوب کرنے کے لئے کسی مصنوعی شان وشوکت کو اپنائے اس مصنوعی پن کو چھپانے کے لئے اسے جھوٹ بھی بولنا ہوگا اور پھر جھوٹ پر جھوٹ چھپانے کیلئے وہ مسلسل جھوٹ بولتے رہنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اس دروغ گوئی کا اثر اولاد پر بھی پڑے گا۔ اور ایسی ماں معاشرے میں گندے جراثیم پیدا کرنے کا سبب بنے گی۔ اگر وہ سادہ سی عورت ہے۔ انا کی تسکین کے لئے جھوٹ بولنے کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتی۔ ایسی عورت حقیقی دنیا میں حقیقی اور پرلطف زندگی گذار رہی ہوتی ہے۔ اپنے کسی پول کے کھل جانے کا اسے کوئی ذہنی دھڑکا نہیں ہوگا۔ ذہن پر دباؤ نہ ہوتو زندگی پرسکون ہوتی ہے اور جسم کا سارا نظام معمول کے مطابق کام کررہا ہوتا ہے ایسی ماں کے کردار کا گھنیرا سایہ براہ راست اولاد پر پڑتا ہے۔ اچھی اولاد کو اچھی تربیت دے کر اچھا شہری بنانے والی عورت کی شخصیت دو یکدم مختلف کرداروں میں بٹ کر نہیں رہ جاتی ایک لباس وہ عورت عمومی حالات میں اپنے گھر میں پہن کر رکھتی ہے دوسرا لباس وہ جو اسے دکھلاوے اور فیشن کی خاطر زیب تن کرنا ہوتا ہے۔ زیور کی ایک قسم وہ جو اس نے گھر میں ہر وقت پہنے ہوتے ہیں اور دوسری قسم زیوروں کی وہ جو عورت زیبائش اور خودنمائی کی نیت سے پہنتی ہے۔ عورت کا ایک سمپل اور اصلی چہرہ وہ ہوتا ہے جو کسی فازے کے بغیر گھر میں دیکھنے کو ملتا ہے اور دوسرا چہرہ وہ جو تمام تر مصنوعی طریقوں سے تبدیل کر کے دوسروں کے دکھانے کو تیار کیا جاتا ہے۔ جب عورت کی اپنی اصلیت بھی دو مختلف کرداروں میں بٹ جائے تو بتایئے کیا اس کی عظمت

Marfat.com

قائم رہ سکتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ اور اگر عورت عظیم نہیں رہ سکتی تو پھر وہ انسانیت کے درجے سے بھی گر جاتی ہے۔ آج یورپ کی عورت کے اندر کی عورت مر چکی ہے۔ ان عورتوں سے اس موضوع پر حقیقت پسندی سے بات کی جائے تو ان کے اندر کی عورت روتی ہے وہاں کی جمہوریت نے عورتوں کو صرف سیاسی آزادی ہی نہیں دی انہیں شمع محفل بھی بنا ڈالا ہے۔ طبی نکتہ نظر سے بھی اگر دیکھا جائے تو جسم کو زیادہ مصنوعی طریقوں سے ملغوف کرنے پر بڑی پیچیدہ بیماریاں رونما ہوتی ہیں۔ وہ بھاری بھر کم لباس جس کے تانے بانے میں سوت کی بجائے مختلف نائیلون اور ریشم کے دھاگوں کا استعمال کیا جاتا ہے جسم سے ہوا کا براہ راست تعلق ختم کر دیتا ہے۔ چنانچہ جسم کے مسام کیا بند ہوتے ہیں، انواع واقسام کی جلدی بیماریاں جنم لیتی ہیں اور پھر ان جلدی بیماریوں کا علاج اس وقت تک ممکن نہیں ہوتا جب تک زرق برق لباس کو اتار کر سوتی اور سادہ لباس کا مستقل استعمال نہ کیا جائے۔ نائیلون ویسے بھی جسم کے بالوں سے رگڑ کھا کر بجلی کی ایک خاص ارتعاش پیدا کرتا ہے جو کسی صورت میں بھی صحت کیلئے سودمند نہیں ہے۔ پھر ظاہری صورت پر چہرے کو زیادہ پرکشش اور نام نہاد جاذب نظر بنانے کے لئے جو مصنوعی غمازے استعمال کئے جاتے ہیں وہ تمام کیمیاوی مادوں سے بنتے ہیں ان کیمیاوی مادوں کے مضرت رساں اثرات جلد پر مرتب ہوتے ہیں چنانچہ فیشن زدہ عورت کے لئے ایک اسٹیج ایسی بھی آتی ہے کہ اس کا چہرہ بگڑ جاتا ہے اور بگڑے ہوئے چہرے کو چھپانے کے لئے وہ ہمہ وقت لیپا پوتی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ یہ کتنا بڑا ذہنی عذاب ہے کہ عورت خدا کا شہکار ہے لیکن فیشن کے ہاتھوں وہ اس طرح سے تباہ ہو جائے کہ کسی کو اپنا اصلی چہرہ دکھانے سے بھی شرمائے۔

عورت کا سادگی کے ساتھ ایک قدرتی تعلق ہے اور اس موضوع پہ انسان لکھنے لگے تو کتابوں کی کتابیں لکھی جا سکتی ہے۔ دین اسلام نے تو عورت کے موضوع کو ایک مکمل نظام تخلیق کی حیثیت میں تفصیل سے بیان کیا ہے اور فرامین الہیہ کی سچائی کو ثابت

Marfat.com

کرنے کے لئے اپنے اردگرد پھیلی ہوئی دنیا سے ہزاروں مثالیں دی جاسکتی ہیں۔تاریخ کا ارتقاء ثابت کرتا ہے کہ جب تک عورت نے اپنی ذات اور اپنے کردار سے منسلک توقعات کو پورا کیا تو دنیا ایک علم و فضل اور امن و امان کا گہوارہ بنی رہی۔کردار سے وابستہ صفات میں سے ایک صفت سادگی بھی ٹھہرتی ہے۔

Marfat.com

اے پاک زمیں! میں تیرا مجرم ہوں

اس دفعہ بھی تیئس مارچ گذشتہ سالوں کی طرح گذر گیا۔ توپوں کی سلامیاں ہوئیں۔ مسجدوں میں دعائیں مانگی گئیں۔ پریڈیں ہوئیں۔ سیمینار، جلسے اور تقریروں کے میلے لگے۔ میڈیا پر بڑے بڑے بقراطوں نے "دانشمندیاں" جھاڑیں۔ ان تمام عواقب و شواہد پر شرح وسط سے روشنیاں ڈالی گئیں جو قرار دادِ پاکستان اور پھر وجودِ پاکستان کا موجب بنے۔ علامہ اقبال اور قائداعظم کی تعریف وتوصیف میں زمین آسمان ایک کر دیا گیا۔ شام ہوئی۔ تیئس مارچ ختم ہوا۔ اب وہ سارے عہدوپیان اور وعدے وعید دھواں بن کر تحلیل ہو جائیں گے، جو ہم دن بھر دہراتے رہے ہیں۔ تقریروں کے ہال سے ہم باہر آ چکے ہیں۔ اب پھر وہی چور بازاری، وہی بدعہدی، وہی بددیانتی اور وہی نفس پرستی ہوگی جو گذشتہ پینتالیس سال سے ہمیں دامن گیر ہے۔ دراصل تیئس مارچ اور چودہ اگست اب ہمارے "روزِ اعتراف" (Confession Days) بن گئے ہیں۔ ان ایام پر ہم تقریریں جھاڑ کر، اپنے مرحومین قائدین کے ناموں کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ لگا کر اور ان کی حکمت وفراست کی تعریف کر کے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ پورے ایک سال ہم نے جو بددیانتیاں اس مملکتِ خداداد سے کی ہیں ان کے گناہ جھڑ گئے اور پھر اس فریضے سے فارغ ہو کر ہم پہلے سے بڑی بددیانتیاں کرنے کے لئے تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ یہ نئی گھناؤنی بددیانتیاں ہم خشوع وخصوع کے ساتھ سال بھر انجام دیتے رہتے ہیں اور پھر ان دو ایام کو شانِ شایان طریقے سے منا کر اپنی حُب الوطنی کی قبر تازہ کر لیتے ہیں۔ میں بھی اسی عاقبت نااندیش قوم کا فرد ہوں۔ میرے اندر وہ تمام صفات موجود ہیں۔ جو اَسی فیصد

Marfat.com

افراد میں پائی جاتی ہیں۔ میں بھی اپنے ہم عصروں کی طرح پہلے اپنے بزرگوں کی حب الوطنی سے معمور تقریریں سنتا رہا اور گذشتہ بیس بائیس سال سے یہی تقریریں خود کر رہا ہوں۔ مجھے تخلیق پاکستان کے پس منظر کے ایک ایک پل کی کہانی اسی طرح یاد ہے جیسے کسی اچھے حافظ کو قرآن پاک۔ میں گذشتہ چالیس سال سے انہی توپوں کی سلامیوں، تاریخی قصے کہانیوں، رحمۃ اللہ کی گونجوں، پاکستان کا مطلب کیا کے نعروں، اخباروں رسالوں کے تاریخی ایڈیشنوں، ہالوں میں جذباتی مقرروں کی دھاڑتی ہوئی آوازوں اور کھوکھلے دعووں میں اپنی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ میں اندر سے اتنا ہی کھوکھلا ہوں جتنی ہمارے مقرروں کی دشمنان اسلام کو دھمکیاں ہیں۔ یہ محض اتفاق ہے کہ اس دفعہ جب ایک کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں تقریر کر کے میں شام کو گھر لوٹا تو تنہائی میں خود سے ہمکلام ہوا کہ اس مملکت خداداد نے مجھے کیا عطا کیا۔ اور اس کے احسانات کو میں نے کس طرح سے لوٹایا۔ میرے دِل و دماغ پر ایک فلم تمام تر ننگے حقائق کے ساتھ چلنے لگی۔

میرے بڑے بتاتے ہیں کہ میری پیدائش وقت سحر ہوئی تھی اور جب میں نے اس دنیائے رنگ و بو میں پہلا سانس لیا تو میرے گھر کے پاس مسجد سے اللہ اکبر کے الفاظ لاؤڈ سپیکر پر گونج رہے تھے۔ اللہ سب سے بڑا ہے گھر کے سب بالغ افراد وضو کر کے رب کریم کے سامنے اظہار بندگی کیلئے جھک گئے۔ کہتے ہیں میرے والد محترم کی پیدائش بھی صبح کے وقت ہوئی تھی لیکن اس وقت کسی مسجد سے اللہ اکبر کے الفاظ سنائی نہیں دیئے نزدیک کے مندر سے گھنٹیوں اور جھجھوں کی آواز گونج رہی تھی۔ خوش قسمت میں ہوں یا میرے والد؟ میں ساری عمر سجدے میں گر کر اس مملکت کی خیر کی دعائیں مانگتا رہوں تو پھر بھی احسان نہیں چکا سکتا۔

میرے دادا اپنے علاقے کے متوسط زمین دار تھے۔ وہ سن انیس سو پچیس 1925ء میں اپنی بڑی بیٹی کی شادی پر گاؤں کے مہاجن سے ایک سو بیس روپیہ (120)

Marfat.com

قرض لے بیٹھے۔ جب تک زندہ رہے تو سال بہ سال کھیتوں کی ساری فصل مہاجن کی نذر کرتے رہے اور جب فوت ہوئے تو مہاجن کی کتاب میں اصل زر کے علاوہ چالیس روپے کا سود بھی ان کے ذمے باقی تھا۔ یہ قرض اور سود میرے والد کو اپنا خون پسینہ بیچ کر ادا کرنا پڑا۔ لیکن جب میں نے ہوش کی آنکھ کھولی تو میرے والد کسی مہاجن کے مقروض نہیں تھے۔ کسی بنیئے کی کتاب میں میرے والد کے خلاف سود در سود کا کھاتہ نہیں کھلا ہوا تھا۔ محکوم فضا میں سانس لینے والے میرے والد نصیب کے سکندر تھے۔ یا آزاد فضاؤں میں آنکھ کھولنے والا میں خوش نصیب ہوں۔ میرا ایک ایک سانس اگر شکرانے کا تانہ بناتا رہے تو حق ادا نہ ہو سکے۔

میرے گھر کے نزدیک واقع خوب صورت مسجد میں پانچ وقت اللہ کا عظیم نام گونجتا ہے۔ اور لاتعداد مسلمان اس عظیم دعوت پر لبیک کہتے ہوئے کشاں کشاں مسجد کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ میرے بچے آج کھلی فضاؤں میں سر پر سفید ٹوپیاں پہنے قرآن کو سینے سے لگائے فخر کے ساتھ اپنے قاری کے پاس کلام اللہ پڑھنے جاتے ہیں۔ کیا میرے آباؤ اجداد محکوم سرزمین پر اتنی بڑی نعمت خداوندی سے فیض یاب ہو سکتے تھے؟ میں اور میرے بچے ایک خودمختار اسلامی مملکت میں پیدا ہوئے اور اپنے باپ دادا سے کہیں خوش نصیب ٹھہرے۔ ہم عمر بھر اگر اس نعمت کے حصول پر حمد وثنائے رب جلیل کرتے رہیں تو بھی کم ہے۔

میرا تعلق سوسائٹی کے متوسط طبقے سے ہے۔ میں نے تعلیم حاصل کر کے قوم کو اپنی خدمات پیش کیں اور میری قوم نے اہلیت کو تسلیم کرتے ہوئے مجھے اعزاز بخشا، وہ مقام دیا جس پر میں اپنے پورے قد سے کھڑا ہوں۔ میرا ایک محکوم بھائی ایم۔ اے کر کے آج بھی کلکتہ اور بمبئی کی سڑکوں پر سائیکل رکشہ چلا رہا ہے۔ ایک سال رکشہ چلا کر وہ ٹی بی کے منہ میں چلا جائے گا۔ اور اس کا جنازہ بھی فٹ پاتھ کے گھر سے اٹھے گا۔ اگر یہ ملک نہ

Marfat.com

ہوتا تو میرے بچے آج پبلک سکول میں پڑھنے کی بجائے کسی ہندو سیٹھ کی دکان پر جھاڑو دے رہے ہوتے۔اور میں اندھیری رات کے سایوں میں زندگی گذار رہا ہوتا۔

ٹاٹا، برلا اور پٹیل کوئی زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔اگر آزادی کا سورج طلوع نہ ہوتا تو فیصل آباد کبھی مانچسٹر نہ بن پاتا۔لاڑکانہ دریا خان اور مردان جیسے چھوٹے شہروں میں شوگر ملیں چینی نہ بنا رہی ہوتیں۔ بلکہ ان شہروں کے لوگ ٹاٹا برلا کے کارخانوں میں مزدوری کر رہے ہوتے۔ڈھاکہ کے اُن مسلمان پارچہ بافوں کو یاد کریں جن کے ہاتھ محض اس لئے قلم کردیئے گئے کہ ان کی ململ کے مقابلے میں انگریز کپڑا نہیں بنا سکتا تھا۔

آج اس مملکت خداداد کے چپے چپے پر سکول، قدم قدم پر کالج اور شہر شہر یونیورسٹیاں ہیں، یہ ادارے عبدالسلام اور سلیم الزماں صدیقی پیدا کر رہے ہیں۔متحدہ ہندوستان میں کتنے مسلمان سائنسدان بن چکے؟ کتنے پی ایچ ڈی کر سکے۔ کتنی یونیورسٹیاں تھیں جو قابلیت کی بنیاد پر مسلمان طالب علموں کو داخلے دے کر انہیں عملی زندگی کے زینوں پر چڑھاتی تھیں۔ہمارے وہ پاکستانی بھائی جو بھارت سے ہو کر آتے ہیں محکوم مسلمانوں کی بدحالی کے عبرتناک واقعات سنا کر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔

جو خود بھوکا ننگا اور قلاش ہو وہ دوسرے کی کیا مدد کر سکتا ہے محکوم قوم اپنے دوسرے مظلوم بھائیوں کے دکھ درد کو محسوس کر کے پی جاتی ہے مگر آہ تک نہیں کر سکتی لیکن جب آزادی کی دولت حاصل ہوتی ہے تو پھر دنیا کے کسی خطے میں کسی مسلمان پر افتاد پڑتی ہے تو آزاد قوم لبیک کہتے ہوئے مدد کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ فلسطین، کشمیر اور جہاد افغانستان اس حقیقت کی زندہ مثالیں ہیں۔آزادی کے جذبے کی پختہ بنیاد قرارداد پاکستان والے دن رکھ دی گئی۔تحریراً ایک منزل کا تعین اور واضح نشاندھی کر دی گئی۔صرف لائحہ عمل باقی تھا۔جو نہ صرف جلد مرتب ہوا بلکہ سات سال کے مختصر عرصے میں اُسے حقیقت کا روپ بھی ملا۔ایک عالم انگشت بدانداں تھا۔اس مفلس و

Marfat.com

نادار قوم کے جذبے پر جسے مارنے کے لئے انگریز اور ہندو اپنی عیارانہ چالوں کے ساتھ میدانِ عمل میں آ گئے تھے۔ وہ عجیب دھوپ چھاؤں کا منظر تھا۔ خوشی اور غم کا عجب ملاپ تھا۔ ایک طرف آزادی کی نعمت نصیب ہو رہی تھی تو دوسری طرف قتل و غارت کا ایک سمندر تھا جس میں سے گذر کر آزادی کے متوالے پاک سرزمین کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ایک طرف لا اِلہ اِلا اللہ کا ورد زبان پر تھا تو دوسری طرف ماؤں سے ان کے بیٹے، سہاگنوں سے ان کے سہاگ اور بہنوں سے ان کے بھائی چھینے جا رہے تھے۔ زندگی خون میں لت پت ہو رہی تھی۔ عجیب جذبوں اور گداز لمحوں کے دن تھے۔ لٹنے والوں کے درد کو انصار پوری طرح اپنے دل میں محسوس کر رہے تھے۔ اپنے اجڑے بچھڑے بھائیوں کو دل میں جگہ دی، گلے لگایا اور اپنے نوالے تک کا شراکت دار بنایا۔ یہاں تک تو کہانی کا وہ حصہ ہے جو ہزار المیوں کے باوجود بھی مستقبل کی خوشیوں اور اُمیدوں سے معمور رہا۔ لیکن اصل صدمے اور المیے تو اس وقت شروع ہوئے جب ایک نحیف و نزار شخص نے کشتی کو ساحل مراد سے ہمکنار کر کے پتوار اپنے جانشینوں کے حوالے کئے اور خود دائمی نیند سو گیا۔

ہوا و حرص کی دوڑ شروع ہوئی۔ وہ تمام ابن الوقت جو مقصد براری کے لئے قائداعظم کی مقناطیسی شخصیت کے سائے میں پناہ گزین تھے میدان خالی دیکھ کر اپنی اصلی جون میں آ گئے۔ کشمیر جو چند گھنٹوں کی محنت اور قربانی کے فاصلے پر کھڑا ہماری آمد کا منتظر تھا، ہم سے چھن گیا۔ الاٹ منٹوں اور کلیموں کا وہ لامتناہی سلسلہ چلا کہ رذیل دنوں میں کروڑ پتی بنے اور خانوادہ شاہ کے عالی مرتبت فرزند و بیٹیاں شاہی مسجد کی سیڑھیوں پر بھیک مانگتی دیکھی گئیں۔ یہ منظر میں نے اپنی چشم گنہگار سے دیکھا ہے۔ محض لفاظی اور زور بیاں مقصود نہیں ہے۔ مہاجرین و انصار دونوں میں انگریز کے پروردہ نواب اور جاگیردار موجود تھے۔ چشم فلک نے دیکھا کہ کسی مردار پر گدھ اس طرح نہیں پڑے جس

Marfat.com

طرح ہمارے نمائندگان باتمکین پہلی جمہوری اسمبلی کے فلور پر لڑے۔ایک دوسرے پر کرسیاں چلیں۔بین الاقوامی میڈیا نے مزے لے لے کر فیچر پیش کیے اور نہرو نے پھبتی کسی کہ اس نے اتنی دھوتیاں تبدیل نہیں کیں جتنے وزیر اعظم پاکستان میں تبدیل ہوئے۔اسلام تو کیا نافذ ہوتا، یہ قوم تو اپنا کوئی دستور نہ بنا سکی۔محلاتی سازشیں عروج پر پہنچ گئیں۔قربانی دینے والے اپنے زخموں کو چاٹتے رہے اور سیاستدان ادھ موئی قوم کا لہو چاٹتے رہے۔راتوں رات پارٹیاں تبدیل ہو جاتیں اور صبح ایک وزیر اعظم کو دھوبی پٹرا مار کر دوسرے کو تخت پر بٹھا دیا جاتا۔ مجھے آئی آئی چندریگر کا زمانہ یاد ہے۔سکولوں کے بچے ابھی اپنے پیارے اور محبوب وزیر اعظم کا نام یاد کرتے پھر رہے تھے کہ وہ چلے بھی گئے اور اسمبلی میں بتایا گیا کہ اب نام یاد کرنے کی ضرورت نہیں۔چند دنوں میں نیا نام یاد کرنے کے لئے بتایا جائے گا۔کیسی آئیڈیالوجی؟ کیسا اسلام اور کیسے آزادی کے تقاضے؟ ہمارے سیاسی گھن چکروں نے پاکستان کے مخالفین کے تمام فلسفوں کو سچ ثابت کرنے کے لئے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ہمارے یہ سارے بڑے جو کسی نہ کسی حوالے سے پاکستان بنانے میں شریک رہے، قیامت کو اپنی دوسری نسل کے مجرم ہوں گے اور قصوروار ہوں گے کہ انہوں نے رات دیکھی ہوئی تھی تو دن کی اہمیت کا احساس آئندہ نسل میں کیوں پیدا نہ کر سکے۔آج میری نسل اندھی نسل ہے۔اس نسل میں رات اور دن کی کوئی تمیز نہیں ہے۔یہ روشنی کی اہمیت سے ناواقف ہے۔اسے قدر نہیں کہ روشنی چھن جائے تو اندھیرے موت ثابت ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ سن اکہتر میں بازو کٹ گیا اور دو قومی نظریے کا تصور دھڑام سے زمین پر آ گیا مگر اس اندھی قوم کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔چند دن سوگواریت طاری رہی، اس کے بعد پھر وہی بے حسی، آج میری نسل کا کوئی شخص الا ماشاء اللہ پاکستانی نہیں ہے۔آج اس زمین پر سندھی، بلوچی، پنجابی اور پٹھان بستے ہیں۔آج یہاں ایک خدا، ایک رسول اور ایک قرآن کا تصور

Marfat.com

نہیں۔ آج یہ میری بدنصیب قوم صدیقیوں، فاروقیوں، زیدیوں، کاظمیوں میں بٹی ہوئی ہے۔ زبان، کلچر، مسلک اور علاقے کے نام پر گھر جلائے جا رہے ہیں۔ عزتیں لوٹی جا رہی ہیں، ایک دوسرے کے گلے کاٹے جا رہے ہیں۔ سنی شیعہ کا خون کا پیاسا اور شیعہ سنی کی جان کا ویری۔ اور وہ لوگ جن سے محاذ جائز اور عین عبادت تھی وہ دور بیٹھے ہماری بربادی و تباہی کا نظارہ کر رہے ہیں۔ ملیح اور ملنسار لوگوں کی سرزمین سندھ میں داخل ہو جائیں تو عجیب بے یقینی اور خوف کا ماحول ملتا ہے۔ ہر شخص ہراساں ہے کہ نہ جانے کس وقت کسی سمت سے کلاشنکوف کی گولی زندگی کا چراغ بجھا جائے دوسرے صوبوں میں سے عارضی طور پر بضرورت کاروبار یا عزیز و اقرباء کو ملنے کے لئے جانے والے لوگ اپنے بازوؤں پر امام ضامن باندھ کر گھر سے نکلتے ہیں جب میرے بزرگ مجھے حب الوطن کی کوئی تربیت نہ دے سکے تو میں بھلا اپنی اولاد کو پاکستان سے محبت کرنے کا کیا سبق دے سکتا ہوں۔ میری اولاد معاشرے میں پھیلی ہوئی معاشرتی ناہمواری، معاشی ابتری اور سماجی زبوں حالی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔ وہ میری ''پندو نصائح'' کو بڑی بے یقینی سے صرف احتراماً سنتی ہے۔ اسے قربانیوں والی سچی کہانی لیلیٰ مجنوں اور ہیر رانجھا کی تصوراتی داستان محسوس ہوتی ہے۔ وہ محبِ وطن لوگوں کو اپنی آنکھوں سے ڈوبتا ہوا دیکھ رہی ہے۔ لہٰذا میری باتوں کو ''اگلے وقتوں کی سادہ دلی'' سے تعبیر کرتی ہے۔ اگر میں خود کو شریف شہری سمجھ کر گھر میں ہتھیار رکھنے کو معیوب سمجھتا رہا تو میرا بیٹا اسے شریف آدمی کی بزدلی کہتا ہے۔ وہ میری ''تنخواہ پر گذارہ'' کی عادت کو کمزوری قرار دیتا ہے۔ وہ وہی کچھ کرنا چاہتا ہے جو اس قوم کی نوجوان نسل کر رہی ہے۔ وہ کہتا ہے پیسہ بڑی طاقت ہے وہ کہتا ہے۔ جو چیز دل کو اچھی لگے، جس چیز کی خواہش پیدا ہو، اس کے لئے ترسنے کی بجائے چھین لو آگے بڑھ کر، وہ کہتا ہے کہ امتحان میں اگر کسی کمشنر کسی سرمایہ دار کے بیٹے کو نقل کی سہولتیں میسر ہیں تو یہ سہولتیں بہشتی کے بیٹے

Marfat.com

کو بھی ملیں۔ اور وہ یہ سہولتیں چھین لے۔ اگر میں نے اپنے بیٹوں کی تربیت کی ہوتی تو ان کا نظریہ یہ ہوتا کہ بڑے لوگوں کو غلط کام کرنے سے روک دیا جائے۔ میرا بچہ بدیانتی کے ماحول میں پیدا ہوا۔ بدیانتی کے ماحول میں پروان چڑھ رہا ہے۔ اور کسی ذہنی انقلاب کے بغیر وہ بددیانت ہی رہے گا۔ اے پاک سرزمین میں تیرا مجرم ہوں۔ میں نے تجھ سے سب کچھ وصول کر کے تیرے دامن میں کانٹے بھرے ہیں۔ میرا خدا بھی اس تقصیر پر مجھے معاف نہیں کرسکتا۔

Marfat.com

مقبول اکیڈمی، لاہور

Marfat.com